قیمت : -/10 روپئے

اکتوبر 2008

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

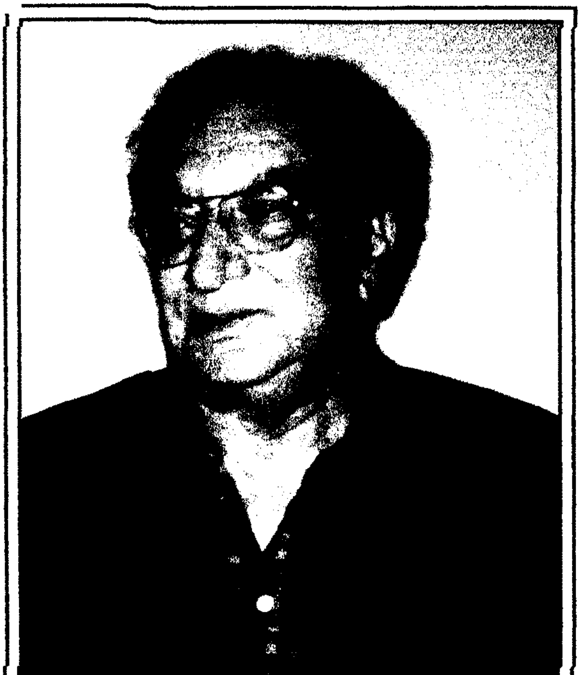

14 جنوری 1931 — 25 اگست 2008

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
BanglaDesh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

رالف رسل بھی نہیں رہے

اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس اور صدمے کے ساتھ سنی گئی کہ اردو زبان وادب بالخصوص اردو شاعری کے شیدائی اور لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد (ریڈر ایمریٹس) رالف رسل کا 14 ستمبر کو اتوار کی صبح لندن کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی شاخ کی سکریٹری ڈاکٹر ارجمند آرا کی جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق رالف رسل انتقال سے دس دن پہلے 4 ستمبر کو اسپتال میں داخل کیے گئے تھے۔ وہ عرصے سے کینسر میں مبتلا تھے جس نے اب سنگین صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ 90 برس کے تھے۔

رالف رسل نے انگریزی میں غالب پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی شہرت کا آغاز ان کی کتاب Three Mughal Poets سے ہوا جو انھوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ یہ کتاب میر، سودا اور میر حسن پر ہے جو پہلی بار 1968 میں ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا برطانوی ایڈیشن 1869 میں Allan and Unwin نے شائع کیا تھا۔ ان کی دوسری کتاب Ghalib: Life and Letters کے بھی دو ایڈیشن نکلے۔ غالب پر ان کی سب سے اہم کتاب Ghalib: Life, Letters and Ghazals ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، انڈیا نے 2003 میں چھاپی تھی۔ یہ 572 صفحات پر مشتمل ہے۔

رالف رسل نے اردو اس زمانے میں سیکھی تھی جب وہ ہندوستانی فوج میں ملازم تھے ان دنوں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ جب وہ اردو بولتے تھے تو ان کا لہجہ پٹھانوں کے لہجے کی یاد دلاتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے رسل کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی فوج کی ملازمت کے دوران ان کے اردو کے منشی ایک پٹھان تھے، انھی سے انھوں نے یہ لہجہ اپنایا۔ ان کا ایک اور پٹھان محمد نواز سے بھی ساتھ رہا، وہ اور رسل دونوں برما کے محاذ پر ایک ہی خیمے میں رہا کرتے تھے۔ ان کے لہجے نے بھی رسل کے لہجے پر اثر ڈالا جو دیرپا ثابت ہوا۔

رالف رسل کی انگریزی خودنوشت Findings Keepings: Life, Communism and Every thing کے عنوان سے لندن سے شائع ہوئی تھی جس کا اردو ترجمہ ارجمند آرا نے ''جویندہ یابندہ: کمیونزم اور سب کچھ'' کے عنوان سے کیا ہے جو 2005 میں کراچی سے شائع ہوا۔ وہ اپنی سوانح کی دوسری جلد Losses, Gains مکمل کر چکے تھے اور تیسری جلد پر کام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آپہنچا۔ انھیں کئی برس سے کینسر کا عارضہ لاحق تھا لیکن پچھلے چند مہینوں میں اس نے شدت اختیار کرلی تھی۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے رالف رسل کی اور بھی کئی کتابیں ہیں جو اردو سے دلچسپی رکھنے والے عام انگریزی قارئین اور طلبہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔

رالف رسل کے پس ماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی بیوی بہ قید حیات ہیں لیکن ان میں اور رسل میں کئی برس پہلے علاحدگی ہوگئی تھی۔

رالف رسل انگلستان میں اردو کے سفیر تھے۔ ان کی موت اردو دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے۔ ہم تمام اردو والوں کی طرف سے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ادارہ

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔10، اکتوبر 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938, 26103381
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416, 26109746

شاخ: 110-7-22 قمر دافود ساہو پارکنگ کمپلکس،
بلاک نمبر-5-1، مچھرگلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 6

زبان، ادب اور تعلیم

● پریم چند کا نایاب و نادر مضمون .... پردیپ جین 7
● 1857 کی یاد میں .... نصیر احمد خاں 9
● رومان پسند انقلابی نقاد .... ابوبکر عباد 11
● اردو اور تعلیمِ بالغاں .... روپ کرشن بھٹ 15

گوشۂ احمد فراز

● احمد فراز — چند یادیں .... وارث علوی 17
● کچھ احمد فراز کے بارے میں .... مظہر امام 18
● احمد فراز اور ان کی شاعری .... فضیل جعفری 20
● احمد فراز کی شعریات .... لطف الرحمٰن 22
● لو فراز ہم سے بچھڑ گئے .... صادق 29
● جسم مر جانے سے انسان نہیں مر جاتے .... چندر بھان خیال 30
● احمد فراز کی یاد میں .... سید امتیاز الدین 31
● تاثرات .... مشیر الحسن، محمد حسن، سید محمد عقیل، خلیق انجم 33
.... صدیق الرحمٰن قدوائی، قمر رئیس، بلراج کومل، شمیم حنفی،
.... رفعت سروش، عتیق اللہ، اختر الواسع، علی جاوید، احمد علی برقی اعظمی
● منتخب کلام .... احمد فراز 38

سائنس اور ٹیکنالوجی

● آؤٹ سورسنگ اور ہندوستان .... اعجاز احمد 44
● آن لائن اردو صحافت .... تنزیل اطہر 46

کیریئر

● نیٹ (NET) اردو کی تیاری کیسے کریں .... سید الفت حسین 48

ہماری مطبوعات سے

● افلاطون کا تنقیدی نظریہ .... محمد حسن 50

اردو خبرنامہ .... ادارہ 56

تبصرہ و تعارف

● منتخب التواریخ .... وسیم اقبال 70
● جامع التذکرہ .... ابوبکر عباد ....
● افادات .... ارجمند آرا ....
● دکنی نثر کا انتخاب .... احمد کفیل ....

بچوں کا گوشہ

● سنہرا ہنس .... بدر متین 74
● گنگو مرغا اور سمبو بھیڑیا .... قمر عزاللہ 75

آپ کی بات

■ **ابو اللیث جاوید، ایچ-17، علی اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025**

''اردو دنیا'' کے جولائی 2008 کے شمارے میں اردو کے حوالے سے دو اہم چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ ایک کیو ایل گوتم، سونی پت کا مراسلہ جس میں انھوں نے اپنی اردو دوستی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور اردو کے ساتھ بے انصافی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پارٹیشن کے بعد اردو زبان کو سب سے زیادہ دھکا لگا ہے۔ کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر اردو کو جو کہ ملک کی ایک چہیتی زبان تھی، بری طرح پیچھے دھکیل دیا گیا۔ کون ذمے دار ہے؟ یہ تو ہسٹری ہے۔''

دوسرا عبدالباری مسعود کا مضمون ''مردم شماری 2001 کی لسانی رپورٹ'' بھی اہم ہے۔ اس مضمون میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی کل اردو آبادی 4 کروڑ 34 لاکھ (1991 کی مردم شماری) ہے۔ مگر مختلف ریاستوں کی کل اردو آبادی کا میزان تقریباً 9 کروڑ 45 لاکھ 75 ہزار ہوتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کی یہ بھول بھلیاں اردو والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہیں۔ اتنی بڑی اردو آبادی ہونے کے باوجود اردو زبان کا سرکاری طور پر کوئی مقام متعین نہیں کیا گیا ہے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر اردو بولنے والوں کی اصل تعداد پردے میں ڈال دی گئی ہے جو سراسر اردو زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

اردو سے متعلق سرکاری ادارے اس ضمن میں کوئی اقدام کرنے سے معذور ہیں مگر دوسرے NGOS کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ سرکار کو مسلمانوں کی مجموعی تعداد اور اردو آبادی کا الگ الگ اعلان کرنا چاہیے۔ مردم شماری اب 2011 میں ہوگی اس لیے ابھی سے فضا ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔

■ **محمد یعقوب اسلم، 15، انا نگر، پدور، وانم باڑی-635751**

''اردو دنیا'' کے اگست 2008 کے شمارے میں نامی انصاری صاحب کا خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اردو رسم الخط اور تلفظ کے سلسلے میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں مثلاً مینا کو مَینا پڑھا جائے یا مِینا۔ اسی طرح انھوں نے ملک کی تین شکلیں پیش کی ہیں جب کہ ایک چوتھی شکل بھی ہے، مُلک = دیس + ممالک مِلک = جائداد + املاک، مَلِک = بادشاہ + ملوک، فرشتہ + ملائکہ۔ آگے انھوں نے عربی فارسی اور مغربی زبانوں کے الفاظ کی تحریر اور تلفظ سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زندگی بھر اردو پڑھنے بلکہ پڑھانے کے باوجود کسی لفظ کا غلط تلفظ زبان پر جم جاتا ہے اور آخر میں کہتے ہیں کہ اردو رسم الخط کی اس خامی کا اعتراف تو کرنا پڑے گا۔

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ رسم الخط اور تلفظ کا مسئلہ صرف اردو کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، دنیا کی ''سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان انگریزی کے ساتھ بھی ہے۔ مثال کے طور پر But اور Cell, Put اور Station, Call وغیرہ الفاظ کے تلفظ پر غور کریں۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی اعراب کے فرق سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً دَخَلْتَ = تو داخل ہوا، دَخَلْتِ = تو داخل ہوئی، دَخَلْتُ = میں داخل ہوا، اور دَخَلَتْ = وہ داخل ہوئی۔ اور یہ صورت حال سارے مصادر سے بننے والے ماضی مطلق کے صیغوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔

ہندی زبان میں بھی [illegible] اور [illegible] [illegible] اور [illegible] اور ر کے استعمال کی مختلف شکلوں کے علاوہ ہاتھ سے لکھی گئی شکستہ تحریروں کے پڑھنے کا عمل بھی مشق کا طالب ہے۔

اردو زبان کے رسم الخط کو لے کر مختلف اوقات میں مختلف تحریکیں چلائی گئیں اس کی املا کی اصلاح کی تحریک بھی چلی، جس کی تائید اور تردید میں بے شمار مضامین بلکہ کتابیں تک لکھی گئیں۔ کبھی کاتبوں کی کمی کی بات آئی۔ لیکن موجودہ دور میں کمپیوٹر کتابت کی سہولت حاصل ہو جانے کے بعد بہت سارے مسائل کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ جنوبی ہند کی تمل زبان میں بھی املا کے مسائل موجود تھے لیکن گذشتہ چالیس سالوں میں دروازی حکومتوں کے آغاز کے ساتھ ہی ان پر قابو پالیا گیا۔ ان حکومتوں کے رہنما صرف سیاست داں ہی نہیں تمل زبان کے شاعر، ادیب اور دانشور بھی تھے۔ اس لیے حکومت کی سرپرستی میں ایک منظم اور باقاعدہ رسم الخط منوالیا گیا اور غیر ملکی الفاظ کی مکمل اصطلاحات کا ترجمہ کر کے رائج کر دیا گیا۔ اس کے باوجود تلفظ کی ایک دو خامیاں باقی ہیں مثلاً ایک ہی حرف ایک جگہ 'ٹ' کا تلفظ ادا کرتا ہے تو دوسرے مقام پر 'ڑ' کا۔

زبانوں میں اسی طرح کی گنجائش زبان کی وسعت اور پھیلاؤ کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ کسی کمزوری کی طرف۔ ایک اور بات بھی ہے کہ زبان کے استعمال میں روزمرہ، اور اہل زبان کے محاورے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح کسی عبارت کو پڑھتے وقت سیاق و سباق کا خیال بھی ضروری ہے۔ کسی ایک کے انفرادی تلفظ کو معیار قرار نہیں دیا سکتا، چاہے وہ اردو زبان کا کوئی شاعر یا نیوز ریڈر ہی کیوں نہ ہو۔ ''درخت پر ایک مینا بیٹھی ہے'' اس جملے کو ایک معمولی پڑھا لکھا شخص بھی مَینا ہی پڑھے گا، مِینا نہیں۔ البتہ غیر لسانی اور غیر ملکی طالب علموں کو اس سلسلے میں تھوڑی بہت دقت پیش آسکتی ہے، لیکن وہ بھی تھوڑی سی مشق و

ممارست سے دور ہوسکتی ہے۔ بچوں کی ابتدائی درسی کتابوں میں اس طرح کے الفاظ پر اعراب لگائے جاسکتے ہیں۔ عربی زبان میں اعراب کی اتنی تبدیلیوں کے باوجود عربی اخبارات و رسائل اور کتابیں اعراب کے بغیر ہی شائع ہوتی اور پڑھی جاتی ہیں۔ انگریزی سیکھنے والوں کو بھی ابتدا میں تلفظ کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اردو والوں کو اپنی زبان اور اس کے رسم الخط کے تعلق سے کسی غلط فہمی میں پڑنے کی بجائے مثبت اندازِ فکر اختیار کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد، اردو کو رومن خط میں لکھنے یا اس کے لیے ہندی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریکیں بھی بعض گوشوں کی طرف سے چلائی گئیں لیکن اردو والوں کے سخت احتجاج اور استقلال نے انھیں کامیاب ہونے نہیں دیا۔

■ جمیل ظہیر، ملاذ، نیو کلونی، نیو کریم گنج، گیا-823001

''اردو دنیا'' کے ماہ اگست 2008 کے شمارے میں جناب مخمور سعیدی کا مضمون ''ساغر خیامی: قہقہوں کا سوداگر'' نے ایک صحت مند روایت کو زندہ کیا ہے۔ وہ روایت روز بہ روز دھندلاتی جارہی ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کے مرجانے کے بعد، اس کے ہمعصروں کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کی شخصیت کے گمنام گوشوں سے پڑھنے والوں کو واقف کرائیں۔ جناب مخمور سعیدی کا یہ خاکہ پیش کش اور مواد دونوں لحاظ سے بڑا جاندار ہے۔

جناب قسیم طارق نے مخدوم محی الدین کی نظم ''چارہ گر'' کے تجزیے میں نظم کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کسی بھی شاعر کو سمجھنے اور پڑھنے کے لیے اس کے عہد اور اس کے عقیدے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جناب قسیم طارق نے زیر بحث نظم کو تصوف سے منسوب کیا ہے، جس کی یہ نظم متحمل نہیں ہے۔ مخدوم محی الدین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے متعلق تھے اور اس پارٹی کے Cadre سے سر...... ہے۔ لہٰذا ان کی اس نظم کو تصوف کے زمرے میں لانا ان کی پارٹی اور ان کے عقیدے سے انحراف ہوگا۔ پھر بھی رومانیت اور صوفیت کسی تحریک اور گروپ سے منسوب نہیں ہے۔ رومانیت تو ہر شاعر کے عہدِ شباب کا تقاضا ہوتا ہے جس سے کسی شاعر کی شاعری خالی نہیں ہے۔ تصوف سے اثر پذیری زندگی کے آخری پڑاؤ کا اندازِ فکر ہوتا ہے۔ لیکن مخدوم کی یہ نظم پچھلی صدی کے پچاس کے آس پاس کی ہے، جبکہ مخدوم چالیس یا بیالیس سال کے تھے اس عمر میں تصوف کی گنجائش کہاں ہے۔ کسی لحاظ سے یہ نظم تصوف کی حد بندی میں نہیں آتی۔

جناب قسیم طارق کا کہنا ہے کہ اس نظم کی پوری کیفیت اور فضا ماورائی اور روحانی ہے۔ صوفیہ کے ملفوظات سے صرف نظر کرکے پوری نظم خصوصاً اس کے تین مصرعے ''پیار حرف وفا'' پیار ان کا خدا'' ''پیار ان کی چتا'' کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ جہاں تک ان لفظوں کا تعلق ہے ان کا جو خصوصی طریقِ اظہار پیار کے متعلق سماجی بندشیں اور مذہبی مزاحمت کا ردِ عمل ہے۔ اسی سلسلے میں مندر، مسجد، میکدے کا تذکرہ آیا ہے۔ لیکن نظم کی خاص بات اس کا ارتقائے خیال ہوتا ہے۔ اس طرح اس نظم کے آخری بند کو نظر انداز کرکے شاعر کی فکر تک رسائی ممکن نہیں ہے اور یہی آخری بند کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے ''چارہ گر'' کو مذہبی پیشوا یا خالقِ دو جہاں کے لیے استعمال کیا ہے جس سے مخدوم کے مخصوص انقلابی رویے اور جذبۂ سرکشی کا اظہار ہوتا ہے:

ازازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

■ ایم راگھوراؤ، سائتھ سول لائنس، چھندواڑا (مدھیہ پردیش)

''اردو دنیا'' کا شمارہ اگست 2008 نظر نواز ہوا۔ اس کے سبھی مضامین بے حد پسند آئے۔ خاص کر ''محمود ایاز اور جدیدیت'' محمود ایاز نے خلوص اور ایمانداری کو اپنا رہنما بنایا تھا۔ ان کے جملے کسی بھی دور کے ادب کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ندافاضلی کا مضمون ''سنسار کے بازار میں'' خوب ہے۔ اب خدا اشتہاروں میں ہی ملتا ہے۔ مضامین ''آم'' شارک مچھلیاں'' اور ''پانی اور صحت'' معلومات سے بھرپور ہیں۔

''ہماری بات'' میں آپ نے صحیح فرمایا کہ ساری خرابیوں کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے اخلاقی اصولوں کو اپنی زندگی سے بے دخل کردیا ہے۔

''سید مصطفےٰ کمال سے گفتگو'' دلچسپ لگی۔ پروفیسر محمد حبیب کا مضمون ''سلطان ابراہیم لودھی'' تاریخ کی ایک مشہور شخصیت سے روبرو کراتا ہے اور ''جنگلات کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت'' ہمیں جنگلات کی اہمیت کی یاد دلاتا ہے۔ تبصرہ اور تعارف سے تنقیدی سرمائے میں اضافہ ہورہا ہے۔

■ ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش-503002

''اردو دنیا'' کا اگست 2008 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ قارئین کے response سے رسالے کی وسعت اور افادیت و اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ ''ہماری بات'' میں ایک اہم عصری موضوع کو سمویا گیا ہے یقیناً ہمارا سماج ایک بازار اور منڈی میں تبدیل ہوتا جارہا ہے جس میں صارفیت و مادیت کا بول بالا ہے۔ سماجی، انسانی اور اخلاقی قدریں پامال ہورہی ہیں۔ اب ہم پڑوس میں رہ کر اجنبی جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ بزرگوں کی کوئی قدر نہیں، دنیا اخلاقی انقلاب کی منتظر ہے۔ اداریہ عبرت انگیز ہے اور آج کے سماج کے لیے سبق آموز بھی۔ قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے ''شعر فراق کی تہذیبی قرأت'' میں فراق

کے کلام میں ہندوستانی عناصر اور ہندوستانیت کی بہت واضح نشاندہی کی ہے۔ مخمور سعیدی نے ساغر خیامی کی زندگی کے حالات و واقعات اور کلام کی خصوصیات اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ شمیم طارق نے مخدوم کی نظم "چارہ گر" کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ غزل ہو یا نظم اس میں معنی کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں جتنا غور و فکر کریں گے ویسے معنی ذہن میں آتے رہیں گے۔ سرور الہدیٰ نے "محمود ایاز اور جدیدیت" پر وقیع مقالہ قلم بند کیا ہے جس میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے تعلق سے بھی حقائق کا اظہار ہے۔ اردو میں جدید ادب کی توسیع میں "سوغات" اور "شب خون" نے نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ فاضلی نے "سنسار کے بازار میں" عصری سماج کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ سماج میں انسانی قدریں معدوم ہو رہی ہیں زندگی کے ہر شعبے میں خود غرضی و مفاد پرستی عام ہوتی جا رہی ہے۔ محمد خلیل نے "جنگلات کا تحفظ" میں اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنگلات کے کٹنے سے ماحولیات میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے اور انسانیت کی بقا کے لیے ماحولیات میں توازن ضروری ہے۔ "پانی اور صحت" میں جمال نصرت نے جو باتیں کہی ہیں توجہ طلب ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کا انٹرویو بھی خوب ہے، انھوں نے طنز و مزاح سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ ہماری مطبوعات سے، تبصرہ و تعارف اور بچوں کا گوشہ بھی دل چسپی سے پُر ہے۔

■ **ڈاکٹر رضوانہ ارم، صدر شعبۂ اردو، جمشید پور، ویمنس کالج، جے ایس آر**

"اردو دنیا" اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف"، "شعر فراق کی تہذیبی قرأت"، "ساغر خیامی"، "مخدوم کی ایک پر کیف نظم"، "محمود ایاز اور جدیدیت" نہایت پر مغز اور علمیت سے بھرپور "نگارشات" ہیں۔ علاوہ ازیں ثقافت، ماحولیات، کیریئر، روبرو، ہماری مطبوعات، تبصرہ و تعارف، اور بچوں کا گوشہ گویا اردو دنیا میں معلومات عامہ کا ایک جہان سمٹ آیا ہے۔ اتنا معیاری اور عمدہ ادب کو پیش کرنے کے لیے آپ اور تمام اراکین اردو دنیا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آج اردو ادب کو ایسے رسالے کی اشد ضرورت ہے جس میں اردو کا روشن مستقبل درج ہو۔

■ **اجمل فاروق ندوی، نئی دہلی**

آپ کا ماہ نامہ "اردو دنیا" ہر ماہ زیر مطالعہ رہتا ہے۔ مضامین کے تنوع اور طباعت کے شان دار معیار کی بنا پر ہندوستان کے دو تین گنے چنے رسائل ہی اس کے مقابلے میں آسکتے ہیں۔ محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے ماہانہ کالم نے رسالے کی اہمیت و افادیت کو دو چند کر دیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ رسالہ اسی طرح بلکہ مزید ترقیات کے ساتھ پوری دنیا میں اپنا وسیع سے وسیع تر حلقہ پیدا کرلے۔

■ **عبدالرحمٰن خالد، (لائبریرین، جامعۃ الفلاح)، بے۔ ایف۔ بلریا گنج، اعظم گڑھ (یو۔ پی۔)**

آپ کا مؤقر جریدہ علمی و ادبی حیثیت سے مفید تر ہے۔ ہمارے طلبہ و طالبات اور اساتذہ اس جریدے کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ آپ کے اس مجلّے سے جامعہ کے تقریباً پانچ ہزار طلبہ و طالبات اور اساتذہ و محققین استفادہ کرتے رہے ہیں۔

■ **انوار القرآن نعمت پور، پوسٹ بکس نعمت پور-247129 مظفرآباد، سہارن پور (یو۔ پی۔)**

اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ اور اس کا دائرۂ عمل زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اس کے لیے حامیان اردو سے گزارش ہے کہ حسب ذیل امور پر کمر بستہ ہو کر عمل پیرا ہوں:

(1) چونکہ ہماری اور ہمارے بچوں کی مادری زبان اردو ہے، اس لیے اپنے بچوں کو بالخصوص ابتدائی تعلیم مادری زبان اردو میں دیں اور دلائیں۔

(2) اسکولوں سے قطع نظر اپنے گھروں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست کریں، گفتگو بھی صاف و شستہ اردو میں کی جائے۔

(3) اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھیں، اردو کی کتابیں خرید کر ناشرین کتب کی حوصلہ افزائی کریں، گھر کے تمام افراد میں اردو اخبارات، رسائل و جرائد کے مطالعے کا رجحان پیدا کریں۔

(4) کاروباری اداروں، کارخانوں، فیکٹریوں، سواریوں، رہائش گاہوں، دکانوں، مکانوں، بنگلوں، دفتروں پر سائن بورڈ اور ناموں کی تختیاں وغیرہ اردو رسم الخط میں لکھوا کر لگائیں۔

(5) وزیٹنگ کارڈ، لیٹر پیڈ پر اپنا نام و مکمل پتہ اوّل اردو میں لکھوائیں، خط و کتابت ہمیشہ اردو میں کریں، خطوط پر پتہ پہلے اردو میں لکھیں، دستخط ہر جگہ اردو میں کریں۔

(6) شادی بیاہ کی تقریبات، جلسہ و جلوس کے اشتہارات و اعلانات کے فولڈر، پوسٹر اور دعوت نامے اردو میں چھپوائیں۔

(7) گھر اور دکان کے سامان کی فہرست آمد و خرچ کا حساب اردو میں لکھیں۔

(8) حامیان اردو جذبۂ ایثار سے بستی بستی، محلہ محلہ اردو کے تعلیمی سینٹر قائم کر کے رضاکارانہ طور پر اردو پڑھائیں، اردو پڑھاؤ تحریک چلائیں۔

(9) انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین اور سرپرست اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا مطالبہ ذمے داران اسکول

سے کریں۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچے خود بھی ذوق و شوق سے اردو پڑھیں لکھیں اور بولیں۔

(10) مردم شماری کے زمانے میں مادری زبان کے خانے میں لفظ اردو اپنے سامنے پُر کروا کر بعدۂ جانچ بھی کرلیں۔

(11) اپنے بچوں کا داخلہ ایسے اسکول میں کرائیں جہاں اردو کا مضمون بھی پڑھایا جاتا ہو۔

(12) مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے محکمۂ تعلیمات کے وزرا، افسران و ذمے داران سے مل کر اردو کی تعلیم و ترقی کے لیے اردو میڈیم اسکول کھولنے کی مانگ کریں اور قدیم اسکولوں میں مزید ماہر اردو اساتذہ بڑھانے پر بھی زور دیں۔ جہاں اردو نہیں پڑھائی جاتی وہاں شعبۂ اردو منظور کرائیں۔ اردو کے اصحاب فکر و نظر کو اس بارے میں ان تھک کوششیں کرنی چاہئیں۔

(13) ہر اردو داں اپنے حلقۂ اثر میں ہر جاننے والے کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کرے، نیز اپنے بے لوث جذبے کے ساتھ اردو کے لیے کام کرنے کی خواہش اور تڑپ پیدا کرے۔

(14) ان تمام محکموں کے دفاتر میں جہاں اردو کے مترجم موجود ہیں درخواستیں اردو میں ہی دیں، اقلیتی فلاح و بہبود کے دفاتر، اردو تنظیموں، اردو انجمنوں، اردو اکادمیوں، اردو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، غالب اکادمی جیسے اداروں میں مراسلت اردو ہی میں کریں۔

(15) ہمارا بیشتر مذہبی اور ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی، تاریخی اور تدریسی سرمایہ اردو زبان میں ہے، اس لیے اردو کی نئی نسل تیار کرنا ہم سب کا اخلاقی فریضہ ہے، آنے والی نسل اگر اردو سے ناواقف رہی تو یہ سارے کا سارا اثاثہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھانا لازم جانیں۔

■ حبیب الرحمٰن چغتائی، حریم، دودھ پور، علی گڑھ-202002

آپ کا ممنون ہوں کہ اردو دنیا کے تازہ شمارے ستمبر میں میرا مضمون ''نشاط آبلہ پائی'' شامل اشاعت ہوا ہے۔ اطہر صدیقی کے ایک اقتباس میں غلطی ہوگئی ہے براہ کرم اسے درست کرلیا جائے۔ صفحہ 26، سطر 11 پر اقتباس کو یوں پڑھا جائے ''پانچ چھ ہزار کلو میٹر لمبی ہے۔'' اس شمارے میں مشمولات بہت خوب ہیں بالخصوص زبان و ادب سے متعلق۔ رسالہ کل ہی ملا ہے اس لیے ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سی-501، راؤز ایونیو اپارٹمنٹس، میور وہار، نئی دہلی

اردو دنیا کا ستمبر 2008 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اردو رسم الخط پر اردو کے مایۂ ناز محقق جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے فاضلانہ مضمون سے خاص طور سے مستفید ہوا۔ اس عدیم المثال اور محکم ترین دلائل سے بھرپور فاضلانہ مضمون لکھنے پر فاروقی صاحب اردو کے سارے محبوں اور حامیوں کی طرف سے مستحق صد تبریک و تہنیت ہیں۔

■ زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-15

''اردو دنیا'' کا ماہ ستمبر 2008 کا شمارہ حسب معمول بروقت موصول ہوا۔ ''زبان اور تعلیم'' کے کالم کے تحت واقعی سارے مقالات وقیع ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ بعنوان'' کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں'' اگر چہ مطبوعہ ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ہم جیسے عام قاری تک اس کی ترسیل ضروری تھی۔ مقالہ خصوصاً ان حقائق پر روشنی ڈالتا ہے کہ اردو کو رومن رسم الخط میں Translaterate کرنے سے کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی۔

علی رفاد فتیحی کا مضمون ''اردو لغطیات پر انقلاب 1857 کے اثرات'' بھی اہم ہے لیکن یہ ایک صدی قبل کی لغطیات کو پرکھنے کی سعی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ اردو لغطیات کا محاکمہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کن تبدیلیوں اور مراحل سے گزر رہی ہے۔ اسی طرح ''ہمزہ'' کی تعیین سے متعلق انیس چشتی کی تحریر دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ کیریئر کے تحت کاشف غزالی اور فاروق احمد درویش پوری کے مضامین طلبہ کے لیے انتہائی مفید ہیں۔

ایک ناقص مشورہ یہ کہ مترجم اور مطبوعہ مضامین کو اوریجنل اور غیر مطبوعہ مضامین پر ترتیب اشاعت کے لحاظ سے ترجیح نہ دی جائے۔

■ سرفراز جاوید، A164، مزار والی گلی، کرشن کالونی، پٹیل چسٹ، دہلی-7

ماہنامہ اردو دنیا ستمبر 2008 میں آپ نے میرا تبصرہ فکر و تحقیق پر شائع کیا ہے۔ اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ سے ایک شکایت بھی ہے کہ میں نے جناب جمشید احمد کے مضمون کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ مضمون اس شمارے کا سب سے کمزور مضمون ہے اور غالباً کسی مصلحت کی بنیاد پر شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو یہ بات ناگوار لگی اسی بنا پر آپ نے اس فقرہ کو تبدیل کر کے یہ کر دیا کہ ''اس میں شک نہیں مجید امجد بہت اہم نظم نگار ہیں لیکن ان کی نظم نگاری کا یہ مطالعہ تشنگی بڑھا دیتا ہے۔''

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ایڈیٹنگ کی آزادی تو حاصل ہے لیکن میرے خیالات میں تحریف کی آزادی حاصل نہیں۔ آپ یہ تو لکھ سکتے تھے کہ'' ان کی نظم نگاری کا یہ مطالعہ تشنہ ہے'' لیکن ''تشنگی بڑھا دیتا ہے'' آپ نے کس طرح کر دیا؟ اس ایڈیٹنگ سے میرے بیان کا مقصد فوت ہوگیا اور میں نے جس مضمون کو کمزور بتایا تھا، وہ آپ کی ایڈیٹنگ کی بنا پر اس شمارے کا سب سے عمدہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔

□□□

ہماری بات

ہندوستان اور پاکستان برصغیر کی دو آزاد اور خود مختار مملکتیں ہیں۔ تقسیم نے انھیں دو جداگانہ سیاسی اکائیوں کی حیثیت دے دی ہے اور اس حیثیت کا اعتراف و احترام ضروری ہے۔ لیکن یہ دونوں مملکتیں جغرافیائی قربتوں کے علاوہ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے اس نومولود ملک کی انفرادی تہذیبی اور ثقافتی پہچان قائم کرنے کی کوششیں بھی وہاں کے بعض حلقوں کی طرف سے کی جاتی رہی ہیں۔ پاکستانیوں کو ایسا کرنے کا حق ہے اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے لیکن صدیوں پرانی روایات کے تسلسل کو یکسر ختم کر دینا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اسے شاید دونوں ملکوں کی بدقسمتی ہی سے تعبیر کیا جائے گا کہ ان کے سیاسی تعلقات میں وہ خوشگواری کبھی نہیں آسکی جو ایسے دو پڑوسی ملکوں کے درمیان ہونی چاہیے جن کی تاریخ و تہذیب اور تمدنی فضا مشترک رہ چکی ہے۔ دونوں ملکوں کے صاحبانِ اقتدار ایک دوسرے کی طرف سے بدگمانی اور بدظنی میں مبتلا رہے ہیں۔ دونوں ملکوں میں فوجی صف آرائیاں بھی ہو چکی ہیں لیکن دوسری طرف دونوں ملکوں کے عوام اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں جس کا اظہار ان موقعوں پر بطور خاص ہوتا ہے جب سیاسی کشیدگی میں کچھ کمی آتی ہے اور دونوں طرف کی سرحدیں دونوں طرف کے لوگوں پر کھول دی جاتی ہیں۔ ان وقفوں میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے درمیان محبت اور موانست کے جو منظر دیکھنے میں آتے ہیں، وہ اس خیال کو باطل کر دیتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان کوئی حقیقی بنائے مخاصمت موجود ہے۔

اردو شاعری اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کا ایک شاندار اور لازوال مظہر ہے جو لگ بھگ ایک ہزار سال قبل ہندوستان میں مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں کے آپسی میل جول کے نتیجے میں شروع ہوئی تھی۔ یہ روایت کئی مراحل سے گزرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے اور ہمارے اندر اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہنگامی حادثات و واقعات اس پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ انسانی قدروں کا احترام، باہمی رواداری، ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہماری سرشت کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تلخی و ترشی کے وقتی مظاہر کو ہم جلد ہی بھول جاتے ہیں اور محبت کا جذبہ عود کر آتا ہے۔

احمد فراز پاکستانی تھے لیکن ان کی شاعری کی جو پذیرائی ہندوستان میں ہوئی اس سے سب واقف ہیں۔ جب جب موقع ملا وہ ہندوستان آتے رہے اور یہاں کے لوگوں سے محبتوں کی سوغاتیں انھیں ملتی رہیں۔ اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے بھی وہ ہندوستان آئے تھے اور یہاں کے کئی مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ اس وقت کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ اتنی جلدی ہمارے درمیان سے اٹھ جانے والے ہیں۔

احمد فراز غزل کے حوالے سے زیادہ پہچانے گئے اور پسند کیے گئے لیکن وہ نظم پر بھی حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ غزلوں ہی کی طرح ان کی نظمیں بھی بھرپور فنی رچاؤ کی حامل تھیں لیکن غزلوں میں چونکہ انھوں نے بیشتر معاملاتِ دل کا اظہار کیا ہے اور نظموں میں زیادہ تر دنیا کے حالات کو موضوعِ سخن بنایا ہے، شاید اسی لیے ان کی غزلوں نے لوگوں کو زیادہ متاثر کیا اور ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار سینوں میں دل بن کر دھڑکنے لگے:

اب کے ہم بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں، جاناں

فراز کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ فیض سے بہت متاثر تھے، انھیں خود بھی اس سے انکار نہیں تھا، وہ فیض کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے لیکن ان کی شاعری محض فیض کی صدائے بازگشت نہیں ہے، اس کی نمو خود ان کے خونِ جگر کی مرہونِ منت ہے۔

اس شمارے میں ایک گوشہ احمد فراز کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ یہ پوری اردو دنیا کے اس مقبول و محبوب شاعر کو ہمارا حقیر سا نذرانۂ عقیدت ہے۔ ہماری درخواست پر ہمارے جن محترم اہلِ قلم نے بہت کم وقت میں اپنے تاثرات قلمبند کر کے ہمیں ارسال کر دیے، ہم ان کے صمیمِ قلب سے شکرگزار ہیں۔ یہ تاثرات سرسری نہیں ہیں اور ان سے مرحوم شاعر کے فکر و فن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

سرورق کی تصویر کے لیے ہم انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی کے شکرگزار ہیں۔

□□□

پردیپ جین

پریم چند کا نایاب و نادر مضمون — شہیدِ اعظم

پریم چند کے یوم وفات 8/اکتوبر پر قارئین کے لیے خصوصی تحفہ

منشی پریم چند نے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف اپنی تخلیقات کے ذریعے جو جنگ شروع کی تھی وہ آج تک جاری ہے۔ عالمی تاریخ میں سانحۂ کربلا ظلم کے خلاف جنگ کی تحریک بن کر ابھرتا ہے۔ لہٰذا پریم چند جیسا حساس تخلیق کار اس واقعے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

1923 میں واقعۂ کربلا پر پریم چند کا ایک مضمون ہندی ماہنامہ ''مادھوری''، لکھنؤ میں شائع ہوا اور اگلے ہی برس اسی واقعے پر مبنی ان کا ہندی ڈراما بعنوان ''کربلا'' شائع ہوا۔ اس سے پہلے پریم چند کا ایک مضمون 1923 میں ہی ہندی ماہنامہ ''پربھا'' میں بعنوان ''حضرت علی'' شائع ہو چکا تھا۔ یہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ واقعۂ کربلا سے پریم چند بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اس بات کو واضح طور پر تسلیم کرتے ہوئے پریم چند اپنے 22 جولائی 1924 کے خط بنام دیا نارائن نگم میں رقمطراز ہیں:

''میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا۔ ان سے عقیدت ہوئی۔ ان کے ذوقِ شہادت نے مفتوں کر لیا۔'' (چٹھی پتری جلد نمبر 1، صفحہ 146)

پریم چند کی تمام تخلیقات میں اس امر کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ احساسات سے متاثر تھے۔ اس کے برعکس ان کی تخلیقات، ان کا ذہن، ان کی فکر واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اس اتحاد کو جنگِ آزادی کا خاص ہتھیار بھی تسلیم کرتے تھے۔ ہندی میں ڈراما ''کربلا'' تصنیف کرنے کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے خط مورخہ 17 فروری 1924 میں پریم چند نے نگم صاحب کو تحریر کیا تھا:

''میں نے ادھر پانچ مہینے میں اپنے ناول ''رنگ بھوم'' کے ساتھ ایک ڈراما لکھا ہے جس کا نام ہے ''کربلا''۔ اس میں کربلا کے واقعات پر تاریخی حیثیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک ڈراما لکھا گیا ہے۔ اس کا یقین رکھیے کہ میں نے احترام کو کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے۔ مقصد ہے پولیٹکل، باہمی اتحاد کو بڑھانا، اور کچھ نہیں۔''

(چٹھی پتری جلد نمبر 1، صفحہ 141)

ادبی دنیا مذکورہ بالا مضامین اور ڈرامے سے شناسائی رکھتی ہے مگر اس حقیقت سے تا حال نابلد ہے کہ پریم چند کا ایک مضمون بعنوان ''شہیدِ اعظم'' بہار شیعہ کانفرنس پٹنہ کی جانب سے شائع شدہ کتابچے ''کارنامۂ حسین'' میں صفحہ 5 تا 8 شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ''کارنامۂ حسین'' میں صفحہ 5 تا 8 شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ''کارنامۂ حسین'' کا ایک نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پروفیسر جناب سیّد حسن عباس کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رہ گیا اور انھی کی عنایت سے پریم چند کی اس نایاب و نادر تحریر کی زیراکس کاپی راقم الحروف کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ مضمون عباس صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پریم چند ادبیات میں داخل ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

''کارنامۂ حسین'' 56 صفحات پر مشتمل کتابچہ ہے، جس کے آخری صفحے پر درج ذیل تحریر ملتی ہے۔

''سید احمد رضا مالک و منیجر اسلامی پریس، گورہٹہ، پٹنہ سٹی میں طبع ہو کر شائع ہوا۔ 1931ء 1350ھ''

درج بالا تحریر سے واضح ہے کہ پریم چند کا مضمون ''شہیدِ اعظم'' 1931 میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون پر عنوان کے نیچے مصنف کا نام یوں درج ہے۔

''از جناب منشی پریم چند صاحب جرنلسٹ، لکھنؤ''

واضح رہے کہ پریم چند لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ ''مادھوری'' کی ادارت سے 18/فروری 1931 کو سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ ''جرنلسٹ لکھنؤ'' الفاظ کے اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت انھوں نے اپنا مضمون ارسال کیا اس وقت وہ ''مادھوری'' کی ادارت سے منسلک تھے۔ مگر کتابچے کے آخر میں عیسوی سنہ کے ساتھ 1350ھ چھپا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ جس وقت یہ کتابچہ شائع ہوا اس وقت تک پریم چند ''مادھوری'' کی ادارت سے الگ ہو چکے تھے کیونکہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق 1350ھ کی شروعاتی تاریخ 19 مئی 1931 ہے جو کہ منگل کا دن تھا۔ اس کے مدِّ نظر یہ اندازہ لگانا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ ''کارنامۂ حسین'' عنوان کا یہ کتابچہ 1350ھ کے ماہِ محرم یعنی مئی۔ جون 1931 میں شائع ہوا ہوگا اور یہی ''شہیدِ اعظم'' کا زمانۂ اشاعت تسلیم کرنا کچھ غلط نہ ہوگا۔

شہیدِ اعظم

(از جناب منشی پریم چند صاحب جرنلسٹ لکھنؤ)

سانحہ کربلا، تاریخ دنیا کے اُن معرکتہ الآرا واقعات میں ہے جنھوں نے تہذیب کا رخ تبدیل کر دیا ہے۔ اسلامی خلافت کا یزید کے خاندان میں جانا فی

الواقع اسلام کا عالمگیر اخوت اور مساوات کا چراغ گل ہوتا تھا۔ اگر خلافت حضرت حسین کے ہاتھوں میں ہوتی تو اسلامی روایات اپنی اصلی صورت میں نشو پذیر ہوتیں اور فتوحات وملوکیت کے وہ قرون نہ آتے جنھوں نے اسلامی تاریخ کو چاہے شکوہ عطا کیا ہو، پر اس نصب العین سے ضرور گرا دیا جو اسلام کے وجود میں آنے کا باعث ہوا تھا۔ اسلام کا نزول ملک گیری کے لیے نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک خالص روحانی تحریک تھی جس کا منشا دنیا میں استبداد اور ملوکیت کو فنا کر کے مساوات عالمگیر کی اشاعت تھی حضرت ابوبکرؓ، حضرت فاروق عثمانؓ کا زمانہ اس تحریک کی ابتدا کا زمانہ تھا جبکہ اسلامی روایات کی بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ حضرت علیؓ کے مختصر دورِ خلافت میں اسلامی تہذیب کا نشو ونما جس عنوان سے ہوا وہ اگر قائم رہتا تو آج اسلام اپنی شان و شوکت اور فتوحات کے لیے نہیں، اپنی روحانیت اور صداقت پرستی کے لیے ممتاز ہوتا۔ ملک گیری کی ہوس حضرت معاویہ کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئی اور یہ عنصر روز افزوں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ہم اس کی بدترین صورت محمود غزنوی کے اصنام شکن حملوں اور ہسپانی فتوحات کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

حضرت حسین علیہ السلام خلافت اور ملوکیت کے اصولی اختلاف اور اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور اسی لیے انھوں نے، باوجود اس کے حالات ان کے موافق نہ تھے، اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ اپنی اور اپنے عزیزوں کی عزیز جانیں بھی اسلامی وقار کی حمایت اور حفاظت کی نذر کردیں۔ قیاس اسے تسلیم کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا کہ ایسا بے غرض ایسا بے نفس، ایسا اصول پرور بزرگ محض شخصی اور ذاتی اقتدار کے لیے اتنی خونریز جنگ ٹھان بیٹھتا۔

ورودِ اسلام کے قبل توحید کی آواز بلند ہوچکی تھی۔ اس معاملے میں ہندوستان کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ ذات باری کے سوا اور سب چیزیں نیست ہیں، یہ حقیقت پہلی بار ویدوں نے منکشف کی۔ اس کے بعد بودھ مذہب کا ظہور ہوا۔ بودھ مذہب نے ''اہنسا'' کو فائق تسلیم کیا۔ بعد ازاں حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے اور انھوں نے ''رحم'' کو بہترین صداقت تسلیم کیا۔ اسلام نے عالمگیر اخوت و مساوات کو علم بلند کیا۔ اس وقت بھی دنیا آپس کی خونریزیوں سے تنگ آچکی تھی۔ اس خونریزی کا باعث کیا تھا۔ یہی صغیر وکبیر، اعلیٰ و ادنیٰ کی قید۔ بانی اسلام نے خونریزی اور عناد کو دنیا سے یک لخت مٹا دینے کا ارادہ کرلیا تھا اور اس ارادے کی تکمیل کے لیے مساوات کی اشاعت سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی۔ دنیا آج بھی مساوات کی تلاش میں پریشان ہو۔ سوشلزم اور اشتراکیت کیا ہے؟ اسی مساوات کی تلاش۔ تیرہ، چودہ صدیوں کے بعد دنیا جس مسئلے کو حل کرنے کی تجویزیں سوچ رہی ہے، اسے بانی اسلام نے کب کا حل کردیا تھا۔ افسوس یہی ہے کہ جس خطے میں اس کی تخم ریزی کی گئی تھی وہ اس وقت اس کاشت کے لیے موزوں نہ تھا حضرت محمدؐ کے دورانِ حیات میں اور اس کے کچھ دنوں بعد تک اخوت اسلام کی امتیازی خصوصیت رہی۔ حضرت حسینؑ کی شہادت نے اس کا خاتمہ کردیا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو حضرت حسینؑ کی شہادت دنیا کا سب سے عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے۔

اخلاقی یا انسانی یا جذباتی، کسی پہلو سے بھی دیکھیے، حضرت حسین کے لیے شہادت ناگزیر تھی، اہل کوفہ کا بار بار دعوتیں دینا کیا کوئی اہم بات نہ تھی؟ ان دعوتوں کو رد کرنا اخلاقی اعتبار سے قابل اعتراض تھا۔ علاوہ بریں جب اسلام کی عزیز ترین شے پر دستِ تصرف دراز کیا جاتا ہو تو اس شخص کا جو اسلامی وقار کا واحد علم بردار ہو۔ اس کے سوا اور کیا فرض ہوسکتا تھا کہ وہ ذاتی خطرات کو حقیر سمجھے اور حتی الامکان اس کی حفاظت کرے۔ کوفیوں کی دغا کا راز کھل جانے پر ممکن تھا وہ اطاعت اختیار کرکے جانبر ہوجاتے، مگر انسانی اعتبار سے یہ فعل معیوب ہوتا۔ ایک بار مصمم ارادہ کرلینے کے بعد پھر شہادت کے سوا اور کوئی مفر نہ تھا۔ شاید شہید ہوکر ہی حضرت حسینؑ اسلام کی بہترین خدمت کرسکتے تھے۔

یہاں محرم اور عزاداری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنا شاید بعض احباب کو ناگوار معلوم ہو مگر میں اس کا اظہار اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ رام اور کرشن اور بودھ تاریخ سے گزر کر افسانیات کے دائرے میں آگئے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر محققین کی رائے میں مہابھارت اور رامائن تاریخی واقعے نہیں، بلکہ روحانی تجربات ہیں، مہاتما گاندھی ان ہی اصحاب میں ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ ہر ایک دل رامائن اور مہابھارت کا اسٹیج ہے اور ان افسانوں کو تاریخی نگاہ سے دیکھنا ان کی اہمیت کو خاک میں ملانا ہے۔ مگر معرکۂ کربلا ابھی تک ایک مستند تاریخی واقعہ ہے اور شاید آج تک کسی محقق کو یہ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ یہ محض روحانی تجربہ اور نیک وبد کی ازلی جنگ ہو جو ہر ایک دل میں ہمیشہ ہوتی رہتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہمارے شعرا اور ادیبوں نے اس سانحے کو اپنی جودت فکر کا جولا نگاہ بنا کر اسے افسانے کا رنگ دے دیا تاریخ میں شاعرانہ غلو کی گنجائش نہیں۔

اگر ہمارے ادیبوں نے تاریخی واقعات تک اپنے کو محدود رکھا ہوتا تو شکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔ مگر انھوں نے ان کے بیان میں ان تمام لفظی ومعنوی صنائع و بدائع سے کام لیا جو کسی خالص شاعرانہ افسانے کے لیے موزوں تھا اور اس طرح اس سانحے کی تاریخی اہمیت ہی نہیں، اس کی روحانی رفعت کو صدمہ پہنچایا۔ دینی احترام اس کا متقاضی تھا کہ معرکۂ کربلا کو شاعرانہ بلند پروازیوں سے بالاتر رکھا جاتا۔ لیکن فطرت ساری دنیا میں یکساں ہے اور ہر ایک مذہب میں ایسے افراد کی کافی تعداد ہوتی ہے جنھیں اس وقت تک تشفی نہیں ہوتی جب تک بزرگانِ دین کو مافوق الانسان نہ بنا دیا جائے۔ □□□

پتہ:
46-B, New Mandi, Muzaffarnagar-251001

نصیر احمد خاں

1857 کی یاد میں

انگریز تجارت کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنی عیاری اور موقع شناسی سے ملک پر قابض ہو گئے۔ میر جعفر اور صادق جیسے خود غرضوں اور ضمیر فروشوں نے ان کا کام آسان کر دیا۔ ہندوستان کے حریت پسند سپوتوں کو زبردست مزاحمت اور قربانیوں کے باوجود کامیابی نہ مل سکی اور سامراجی طاقتیں ملک پر قابض ہو گئیں۔

دراصل ہندوستان پر انگریزوں کے غلبے کی ابتدا ہی سے ان کے خلاف غم وغصہ کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ان مزاحمتوں میں سنیاسیوں کی بنگال اور بہار کی مزاحمت (1763)، کسانوں کی مدنا پور (1766)، رنگ پور (1783)، میسور (31-1830) اور خاندیش (1852) کی مزاحمتیں زمین دار طبقے کی رام ناتھ پورم (1805-1795)، تراونکور (1808) کی مزاحمتیں اور کتور کی رانی چنما (29-1824) کی مزاحمت خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں بھیل (31-1817)، کول (27-1820)، کھاسی (33-1829) اور سنتھالی (37-1820) قبائیلوں کی مزاحمتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 1806 میں ویلور کی مزاحمت بھی ہماری جدوجہد آزادی کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان مزاحمتوں اور ''بغاوتوں'' میں زیادہ تر کی حیثیت مقامی تھی اس لیے فرنگیوں پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ٹیپو سلطان (1799) نے تین بار انگریزوں کو پسپا کیا اور چوتھی صف آرائی میں ہار کے بعد یہ کہتے ہوئے وطنِ عزیز پر جان نچھاور کر دی کہ ایک دن کی آزادی ایک ہزار سال کی غلامی سے بہتر ہے۔ میر سید احمد شہید (1833) کی مزاحمت بھی شکست انجام ہوئی۔ انگریزوں نے سازش رچ کر سید احمد شہید کی شہادت سے قبل ان کے چار ہزار جانباز وفاداروں کو ایک ہی رات میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

1857 کی بغاوت جیسا کہ سب جانتے ہیں 10 مئی 1857 کو میرٹھ سے شروع ہوئی تھی جو جلد ہی شمالی، وسطی اور مشرقی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں پھیل گئی۔ باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر کے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ اس مزاحمت میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ یہ مزاحمت آنے والی نسلوں کے لیے حوصلے کا سبب بنی اور اس نے بعد میں تحریک آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ یوں اس جدوجہد کو ایک سال کے اندر کچل دیا گیا تھا لیکن 1859 تک امن قائم نہ ہو سکا۔ اس دوران دہلی، لکھنؤ، میرٹھ اور دوسرے علاقوں میں ایک تخمینے کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار لوگ قتل کر دیے گئے تھے۔ یہ ایسی غیر انسانی حرکت تھی کہ خود برطانیہ کے لوگ چلا اٹھے اور انھوں نے ہندوستانیوں کے تئیں اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

1857 کی بغاوت میں مسلمانوں اور ان کے مذہبی، سیاسی اور سماجی رہنماؤں نے نسبتاً زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مسلمانوں کے زیادہ غم وغصہ کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ان کے ہاتھوں سے ہی اقتدار چھینا تھا۔ جب مزاحمت کچل دی گئی تو انگریزوں نے مسلمانوں کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے ان کے خلاف زیادہ سخت اقدامات کیے۔ مذہبی، سیاسی اور سماجی رہنماؤں کو چن چن کر پھانسی پر لٹکایا اور ان کے بیوی بچوں کو در بدر کیا۔ کتب خانوں میں آگ لگا کر نایاب و نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کو راکھ میں بدل دیا گیا۔ سرکاری اور نیم سرکاری نوکریوں سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اثاثے ضبط کر لیے گئے۔ تجارتی ٹھکانوں میں لوٹ مار کی گئی۔

1857 کی جنگِ آزادی کے دوران فرنگیوں کے ظلم وستم کی کہانی اردو کے لوک گیتوں تک میں در آئی ہے: چند مثالیں دیکھیے:

بہو جلد جلد دھان کوٹ لے
کہیں تلنگے نہ گھس پڑیں
میں بنیے کی دوکان دیکھتی ہوں
دال لہسن اور زیرہ لے آؤں
کواڑ بند کر لینا، کہیں ایسا نہ ہو
کہ تلنگے اور گورے گھس پڑیں
یہاں موہ (میرا) من نا لاگے سجنوا
کیوں؟ اس لیے کہ
پکی پکی فصل کمپنی کے دلال کاٹ لیں گے
کھیتوں میں آگ لگا دیں گے
پھر ہم بھوکے مر جائیں گے

ایک جوشیلے نوجوان کے منہ سے گائے اور سور کی چربی ملے کارتوسوں کے استعمال کو لے کر چند بول سنیے:

''سنو، سنو، میری سوگند سنو جو میں نے کھائی ہے
کارتوس کو میں کبھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
ان کا پانی میں کبھی نہیں پیوں گا

میں برہمن ہوں یا راجپوت
شیخ ہوں یا سید
میں مغل ہوں یا پٹھان
ان کے کارتوسوں کو میں ہرگز نہیں کاٹوں گا
سنو، سنو، میری سوگند سنو

ایک بہادر کی شہادت پر اس کی بہن کے تاثرات:

بیرن تیری لاش پہ بہنا ہو جائے قربان
ٹیکہ، جھمکا، کنگن، پہنچی، سب پر ہے دھتکار
خود جو ہوتا سر پر، ہاتھ میں ہوتی تلوار
گھوڑے کو ایڑ لگاتی جا پہنچی رن بھومی میں
داؤ دکھاتی ایسے، بیرن سب رہ جاتے حیران
بیرن تیری لاش پہ بہنا ہو جائے قربان

ایک پرہیزگار نمازی مسلمان کے قتل کا بیان:

میر مرزا بڑے نمازی، اللہ سے لگائے دھیان
بیچ مصلا بیٹھے تھے کہ گھسے حویلی میں شیطان
مہریں، اشرفی مانگیں گورے، تب وہ بھئے بڑے حیران
جب گوروں نے کچھ نہ پایا تو دی بندوق تان
مرزا کی گردن اڑا، ہانس لاگے شیطان
لاش پڑی تھی بیچ مصلا، ہاتھ میں تسبیح تھامے
اللہ گھر وہ سدھارے، پہنے جوڑا جامے
رہے میر میرزا بڑے نمازی، اللہ سے لگائے دھیان

1857 کی بغاوت کی بنیادی وجہ تو انسانی جبلت کا بنیادی وصف یعنی آزادی کا جذبہ تھا۔ کوئی بھی خود دار قوم غلام بن کر رہنا نہیں چاہتی لیکن اس کی کچھ دوسری وجہیں بھی تھیں۔ انگریزوں کی معاشی پالیسی سے کسان اور زمیندار دونوں طبقے پریشان تھے۔ دستکاروں کی بنائی ہوئی چیزیں بازار میں فروخت نہیں ہو رہی تھیں کیونکہ ہاتھوں کی جگہ مشینوں نے لے لی تھی جسے دستکار اپنے خلاف انگریزوں کی سازش قرار دیتے تھے۔ برطانوی تخت سے ہندوستانی صوبوں کے الحاق سے ہندوستان کے حکمراں طبقے کے اختیارات چھن گئے تھے اور وہ انگریزوں کے دست نگر ہو گئے تھے۔ ایک بڑی وجہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں بھی تھیں جو تیزی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو عیسائی بنا رہی تھیں۔ تبدیلی مذہب کی اس مہم نے ہندوستانیوں کے دلوں میں کافی خدشات اور انگریزوں کے تئیں شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ کارتوسوں میں سؤر اور گائے کی چربی کے استعمال نے اس چنگاری کو بھڑکتے شعلوں میں بدل دیا۔

1857 کی بغاوت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی سماج بکھرا ہوا تھا۔ باغیوں میں لیڈرشپ کا فقدان تھا۔ کسی ایک لیڈر پر اتفاق رائے نہیں تھا۔ انقلابی فوج بہادر ضرور تھی لیکن اس میں نظم و ضبط کی کمی تھی۔ انقلابی فوج کی قیادت موثر حکمت عملی تیار نہیں کر سکی۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انقلابیوں کے پاس برطانوی فوج جیسے وسائل نہیں تھے۔ جنگی ساز و سامان کی کمی تھی۔ باغی پیشہ ور فوجی بھی نہیں تھے۔ مزید برآں ذرائع ابلاغ پر فرنگیوں کا قبضہ تھا جس کی وجہ سے زیادہ تر انقلابی ایک دوسرے کے ساتھ رابطے سے محروم تھے۔

1857 کی بغاوت کو ایک عوامی تحریک کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس واقعے کے بعد ہندوستانی عوام سیاسی طور پر زیادہ بیدار ہو گئے تھے۔ سماجی اصلاح کی تحریکوں نے شدت اختیار کر لی تھی۔ 1857 کے بعد ایک تصور یہ بھی ابھرا کہ آزادی برسر اقتدار لوگوں کے بجائے عوام اور ان کے اتحاد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ہندوستان میں مختلف قومی تحریکیں شروع ہوئیں جن میں قوم پرستی کا تصور، آزادی اور سماجی مفادات کی اہمیت اور قومی ترقی کا عزم کارفرما تھا۔

1857 ہماری زندگی میں کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ منفی اعتبار سے 1857 کے بعد ہندو مسلم اتحاد مجروح ہوا۔ انگریزوں کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ 1857 کے بعد ہندوستان برطانوی سلطنت کا حصہ بن گئی اور ہندوستانی مکمل طور پر غلام شہری بن گئے۔ مشرقی اقدار پر مغربی تہذیب کا غلبہ ہو گیا اور جن سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں وہ ہمارے لیے لعنتیں بن گئیں۔ 1857 کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں۔ اس واقعے کے بعد ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا فروغ ہوا۔ ہندوستان کے بیرونی دنیا سے رشتے استوار ہوئے اور ہماری سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی زندگی کی جدید کاری ہوئی۔

1857 کے مجاہدین کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن جنھوں نے انقلابیوں کی رہنمائی کی اور ملک کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ان میں بہادر شاہ ظفر (دہلی)، بخت خاں (بریلی)، کنور سنگھ (آرہ، بہار)، نانا صاحب (کانپور)، حضرت محل (لکھنؤ)، رانی لکشمی بائی (جھانسی)، تانتیا ٹوپے (وسطی ہندوستان) اور منگل پانڈے (بارک پور) کے نام اہم ہیں۔ زندہ قومیں نہ صرف اپنے ماضی کے سورماؤں کو یاد رکھتی ہیں بلکہ ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتی رہتی ہیں۔

□□□

پتہ:
Ex-Chairperson, CIL/SLL&CS/JNU, New Delhi-67

ابوبکر عباد

رومان پسند انقلابی نقاد

ہم اپنے جن اہم، بڑے اور تاریخ ساز شاعر و ادیب کو نظرانداز کرتے یا ان کی بے بہا خدمات سے اغماض برتتے رہے ہیں، ان میں سے ایک اہم شخصیت سید سجاد حیدر یلدرم کی ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم 1904 سے 1908 تک بغداد میں سفارت کار اور 1908 سے 1914 تک سابق امیر کابل کے برطانوی نائب پولیٹیکل افسر رہے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار، اس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے بانی، برسوں تک اس کے اعزازی صدر، ترکی زبان کے معلم و مترجم اور اصلاحی کارکن کی حیثیت سے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ قوم و وطن کی خدمت و ترقی میں صرف کیا۔

یہ صحیح ہے کہ سجاد حیدر یلدرم اپنے ہم عصروں مثلاً علامہ راشدالخیری، خواجہ حسن نظامی، منشی پریم چند اور نیاز فتح پوری کی طرح کل وقتی ادیب نہ تھے — کہ ان کی کثیر جہتی شخصیت، شوقِ سیاحت، ملازمت اور مختلف النوع مصروفیات کے ہوتے ہوئے یہ ممکن بھی نہ تھا— لیکن اس بات سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے کہ وہ مایۂ ناز ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، متعدد فکر و خیال، رجحانات اور اردو مختصر افسانہ کے بنیادگزار ہیں۔

انھوں نے اردو زبان میں ادب لطیف اور نثری شاعری کی راہیں ہموار کیں، "سفر بغداد" کے عنوان سے اردو کا اولین رپورتاژ لکھا، اپنی نظموں اور افسانوں میں ترقی پسند سیاسی اور سماجی شعور کو جگہ دی، پردے کی مخالفت اور تعلیم نسواں کی حمایت کی، سماج میں بیداری لانے کی کوششوں میں مصروف رہے اور نظم و نثر میں نئے نئے تجربات کیے۔ کہانی میں انسانی نفسیات کے موضوع کو متعارف کرایا، پہلے پہل افسانوں میں جدید سلیس زبان استعمال کرنے کی بنیاد ڈالی اور عورت اور جنس کے حوالے سے اپنی کہانیوں میں ان بصیرتوں کا احساس جگایا جن کی توسیع محمد حسن عسکری، آغا بابر، منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ فکشن کے فن پر باضابطہ تنقیدی مضمون لکھنے کی ابتدا کی اور سب سے پہلے طبقۂ اشرافیہ کے بجائے معمولی اور ان پڑھ انسان کو ناول میں بطور ہیرو داخل کرنے کی وکالت کی۔

ہمارے بیشتر نقادوں نے سجاد حیدر یلدرم کو رومانی افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ یہ کچھ غلط بھی نہیں، کہ انھوں نے اپنے ہم عصر ترکی ادب کی رومانی جذبات نگاری سے اثر قبول کرکے اس طرز تحریر کو اردو میں رائج کیا تھا جس سے متاثر ہو کر نیاز فتح پوری اور دوسرے لوگوں نے یلدرم کی اتباع میں لکھنا شروع کیا۔ نتیجتاً وہ سب رومانی ادیب اور ان کی تخلیقات ادب لطیف کہلائیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ بیک وقت ایسے افسانے بھی لکھ رہے تھے جو ادب لطیف سے بالکل مختلف چیز تھی۔ مثلاً "چڑیا اور چڑے کی کہانی" کا رنگ تمثیلی ہے، "حکایۂ لیلیٰ و مجنوں" میں سماج پر گہرا طنز ہے اور "ازدواج محبت" کا موضوع مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم، پردے کی بندش سے آزادی اور اپنی پسند کی شادی ہے۔ یعنی ان کے افسانوی سرمایے میں رومانوی اسلوب کے بالمقابل راست بیانیہ بھی ہے جس کی طرف نقادوں نے کم توجہ دی ہے۔

یوں تو سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت اور ان کی علمی اور ادبی جہات پر تفصیلی مکالمہ قائم کیے جانے کی ضرورت ہے، لیکن فی الوقت ان کی فکشن تنقید سے متعلق گفتگو مقصود ہے، جو ان کی دوسری خوبیوں اور صلاحیتوں کی چمک دمک میں کچھ یوں ماند پڑ گئی کہ کم لوگوں کی نگاہیں اس جانب مبذول ہو پائیں۔

بلاشبہ یہ یلدرم کا امتیاز ہے کہ انھوں نے ناول کے فن پر پہلا باضابطہ مضمون لکھا جو "ناول نویسی" کے عنوان سے "معارف" کے اکتوبر 1898 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ حاجی اسماعیل خاں اور مولانا وحیدالدین سلیم کی ادارت میں علی گڑھ سے 1898 میں جاری ہوا تھا جس کے پہلے صفحے پر رسالے کے مزاج و معیار سے متعلق یہ تحریر درج تھی:

"معارف ایک ماہوار رسالہ ہے جو بلادِ عثمانیہ کے نامور ترکی رسالوں کے نمونے پر مہینے کی آخری تاریخ کو علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں علمی، فلسفی، مذہبی، ملکی، تمدنی، تاریخی اور ادبی مضامین لکھے جاتے ہیں اور مشرقی طرز کی عمدہ اور پاکیزہ نظمیں درج کی جاتی ہیں۔"

اس میں ایک اشتہار بھی تھا جس میں رسالے کی پالیسی اور اس کے قارئین کے حلقے کی بابت ان الفاظ میں اطلاع دی گئی تھی:

"معارف شمالی ہند میں اعلیٰ درجے کا لٹریری رسالہ ہے جو زیادہ تر اونچی سوسائٹی کے ہائی ایجوکیٹڈ مسلمانوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے اور اسی گروہ کے مضامین چھاپتا ہے۔"

یلدرم نے مذکورہ مضمون میں ناول کی مقبولیت کے اسباب اور اس کی فنی خصوصیات اور اس کی مختلف قسموں سے بحث کی ہے۔ یہ مضمون اس عہد کے

افسانوی ادب کی تنقید کے معیار و اعتبار کے علاوہ فن ناول سے متعلق مصنف کے خیالات ونظریات اور ناول کے اجزا وعناصر اور اس کے موضوع ومواد کو زیر بحث لاتا ہے۔ یہ بات اہم اور قابل ذکر ہے کہ سجاد حیدر یلدرم نے اس وقت اس صنف کی ماہیت ومقصود کے تعین کی کوشش کی، جب اردو تنقید بالخصوص افسانوی ادب کی تنقید اپنی ابتدائی منزل کی طرف گامزن تھی اور اس کا اظہار رایوں کی شکل میں یا پھر تبصروں، تقریظوں اور دیباچوں کے علاوہ خطوط میں ہوا کرتا تھا، جن میں اصول وضوابط کی جگہ خیالات وتاثرات اور معروضیت کی جگہ تعصبات وتحفظات کو باریابی حاصل تھی۔

یلدرم نے مضمون میں معتدل رویہ اپنایا ہے اور اپنا مافی الضمیر بڑے واضح انداز اور آسان زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ داستان اور ناول کے فرق و امتیاز پر گفتگو کرنے کے بعد ناول نگار کی ذمے داری اور ناول کے قاری سے متعلق لکھتے ہیں:

''مگر اس میں (ناول میں) اثر ڈالنے کے لیے ہر ناول نویس کو قدم قدم پر ایک بہت بڑی بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی مافوق العادت واقعہ قصہ میں نہ بیان ہو جائے۔ (کہ) موجودہ زمانہ کا قصہ پڑھنے والا ایک عجیب الخلقت شخص ہے۔''

داستانی عہد میں عجیب الخلقت قصہ ہوا کرتا تھا جو قاری یا سامع کو حیرت و تجسس میں ڈالتا اور دلچسپی فراہم کرتا تھا، لیکن ناول کے آغاز کے بعد قاری عجیب الخلقت قرار پایا کہ وہ بیان کردہ واقعات کو منطقی دلائل اور ہر چیز کو سائنسی صداقت کی میزان پر تول کر مطمئن ہوتا ہے۔

یلدرم نے ناول کی کئی قسمیں بیان کی ہیں جن میں ان کے نزدیک اول و اعلیٰ قسم یہ ہے:

''قصہ کی سب سے اعلیٰ قسم وہ مانی گئی ہے جن میں مصنف انسانی فطرت پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالتا ہے، جو اس کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے اور جسے لوگ حیرت زدہ ہو کر الہام کا خطاب دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ انسانی فطرت کا ایسا مطالعہ کرنے والا صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے۔''

شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال نے نزول شعر اور غالب نے خیال میں غیب سے مضامین آنے کی بات کی اور ناقدوں نے شاعر کو 'تلمیذ الرحمٰن' کہا ہے۔ لیکن اب سے چند دہائی پہلے تک شاعری کے مقابلے کمتر درجے کا تخلیق کار سمجھے جانے والے افسانہ نگار کو یلدرم نے اس وقت الہامی کیفیت سے دوچار ہونے والا بتایا تھا جب سوائے چند نفوس کے لوگ انھیں قابل اعتنا بھی نہ سمجھتے تھے۔ اقتباس کا آخری جملہ عام اور اعلیٰ فنکار کے مابین امتیاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ دوسرے درجے پر وہ مقصدی یا افادی ناول کو رکھتے ہیں:

''دوسری قسم کے قصے وہ ہوتے ہیں جن کے ذریعے سے کوئی خاص اخلاقی سبق یا تعلیم دینی مقصود ہوتی ہے۔ اس قسم میں کم و بیش کل ناول آسکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر قصے میں مصنف کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور دکھانا چاہتا ہے۔ اس میں وہ ناول شامل کرنے چاہئیں جو بالقصد کسی خاص غرض کے لیے لکھے گئے ہوں۔''

یعنی ناول نگار کا کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر یا فلسفۂ حیات ہوتا ہے، جو اس کے ناول میں ظہور کرتا ہے۔ یوں اس قسم میں ناول کی جملہ اقسام آجاتی ہیں۔ اقتباس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یلدرم کے نزدیک ناول لکھنے کا یقینی طور سے کوئی محرک ہوتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے درجے پر وہ علی الترتیب تاریخی اور جاسوسی ناولوں کو رکھتے ہیں اور آخر الذکر کی عوامی مقبولیت کا ذکر کرتے ہیں:

''تیسری قسم تاریخی قصوں کی ہے۔ اس میں مصنف کسی خاص تاریخی واقعے کو لے کر کچھ کمی بیشی کے ساتھ افسانے کے پیرائے میں بیان کرتا ہے، پھر سراغ رسانی اور اسرار کے قصے ہیں، ان کی تعداد ہر جگہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور نوجوان اور عام آدمیوں کو یہ بہت پسند آتے ہیں۔''

یلدرم کے مذکورہ مضمون کے تقریباً 33 سال بعد پریم چند نے بھی اس بات کا اعادہ کیا ہے لیکن وہ اپنے زمانے میں جرائم کے ارتکاب اور اس میں اضافے کے خوف سے جاسوسی ناولوں کی بہتات اور اس جانب عوام کے حد درجہ میلان کی شکایت کرتے ہوئے اسے مجرمانہ جبلتوں کو استوار کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے 1931 کے ایک مضمون ''ناول کا فن'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''آج بدکاری، قتل، چوری اور ڈاکہ زنی سے بھرے ناولوں کا جیسے سیلاب سا آگیا ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی دور نہ تھا جب ایسے بے مصرف ناولوں کی ایسی بھرمار رہی ہو۔ جاسوسی ناولوں میں آخر اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ پہلے سے زیادہ گناہ آلود ہو گئے ہیں؟ اس سے یہ تو ظاہر ہی ہے کہ انسان میں حیوانی صفات اتنی توانائی حاصل کرتی جارہی ہے کہ اب اس کے دل میں نرم ونازک جذبات کے لیے جگہ ہی نہیں رہی۔''

بات شاید گناہ آلود ہونے یا لطیف جذبات کے فقدان کی نہیں بلکہ ذہنی تربیت اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے ذوق کی ہے، کہ تب اردو قارئین کی کثیر تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کی تربیت داستان پڑھ کر یا گھروں میں داستان نما قصے کہانیاں سن کر ہوئی تھی۔ یہ قارئین لاشعوری طور پر ناول سے حیرت واستعجاب، مہمات، معرکہ آرائی اور ہیرو کی فتح کے خواہاں تھے اور یہ تمام چیزیں انھیں سنجیدہ ادب کی بجائے جاسوسی ناول، رینالڈس کے

ترجمے یا پھر تاریخی قصے فراہم کرتے تھے۔ حالانکہ عالمی ادب کے مطالعے کے زیر اثر نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جس کی سوچ و فکر اور پسند و ناپسند اردو کے روایتی قارئین سے مختلف تھی اور وہ سنجیدہ چیزوں کو بہر طور پسند اور ادب کے نام پر لکھے جا رہے یابسات کو ناپسند کرتے تھے۔

سجاد حیدر یلدرم اس وقت تک کے انگریزی اور اردو ناولوں کی روشنی میں پلاٹ سے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

''ہمارے ناولوں میں پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہوتی ہے۔ ناول کے لیے عشق اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے جان۔ اس کے بعد جنگ کا نمبر ہے۔ انگریزی پر ہی کیا موقوف ہے خود اردو کے قصوں میں عشق داخل کیا جاتا ہے، لیکن ایک بہت بڑا فرق انگریزی اور اردو کے قصوں میں یہ ہے کہ ان میں جب عشق کا سلسلہ چلتا ہے تو بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے اور اردو میں از سرتا پا بے جوڑ۔ پرانے قصوں میں تو کوئی شاہزادہ چھت پر سوتا ہوتا تھا اور عاشق ہونے کے لیے کوئی پری اڑ کر آتی تھی، یا.....''

یعنی سجاد حیدر یلدرم کو اردو ناولوں کے پلاٹ میں جو سب سے بڑی کمی نظر آتی ہے وہ ہے عشقیہ واقعات کی غیر فطری شمولیت۔ اس عہد کے ناولوں میں جس عشق یا عشق کا جیسا بیان ہوتا تھا وہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے پس منظر میں سنجیدہ اور باذوق قارئین و ناقدین کو غیر موزوں اور بسا اوقات لغو نظر آتا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی مسئلہ تھا کہ جس معاشرے میں پردے کی بندش اور عورت و مرد کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد ہو، تاک جھانک کو معیوب اور شادی سے پہلے عشق کو گناہ عظیم سمجھا جاتا ہو، مصنف اسے اپنے ناول میں کس طور جگہ دے، جب کہ داستان کے مقابلے ناول کی یہ تعریف کی جاتی تھی کہ وہ معاشرے کا ہو بہو عکاس یا حقیقت حال کا بیان ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ نہ تو ہمارے ناول نگار عشق کے بیان سے عاری ناول لکھنا چاہتے تھے اور نہ قاری ایسے ناول پڑھنے پر آمادہ تھے، کہ داستان کا سحر ابھی پوری طرح سے زائل نہ ہوا تھا۔ نتیجتاً دو طرح کے رویے سامنے آئے۔ اول وہ جس کے سجاد حیدر یلدرم شاکی ہیں یعنی عشق کا مہمل یا غیر فطری بیان، دوسرا دنیائے افسانہ سے بیان عشق کا سرے سے اخراج۔ یلدرم آخر الذکر رویے سے متعلق طنزاً لکھتے ہیں:

''میں شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب کا سب سے بڑا کمال اس بات میں سمجھتا ہوں کہ وہ اردو کے پہلے قصہ نویس ہیں جن کی غائر نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ ہندوستانی سوسائٹی (زیادہ صحیح اسلامی سوسائٹی) میں شادی سے پہلے جائز عشق معدوم ہے۔ اس لیے انھوں نے اس کا حصہ اپنے قصوں میں نہیں رکھا۔ اور حق یہ ہے کہ اس کی کمی سے قصہ میں کچھ خرابی واقع نہیں ہوئی۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ یلدرم کے اس طنز کو بعض لوگوں نے سنجیدہ بیان سمجھا اور یہ رائے قائم کرنے کے بعد کہ'' یلدرم نذیر احمد کو اس طور پر مجتہد مانتے ہیں کہ انھوں نے عشقیہ واقعات سے پاک ناول لکھے'' ان پر یہ اعتراض کیا کہ یلدرم کے قول و فعل میں تضاد ہے، کہ وہ خود تو عشقیہ واقعات پر محمول افسانے لکھتے ہیں لیکن عشق کو دنیائے افسانہ سے دیس نکالا دیے جانے پر نذیر احمد کو سراہتے بھی ہیں۔ بہر حال اردو تنقید کے ہر عہد میں ایک آدھ ایسے بھولے بھالے نقاد رہے ہیں جن کی سوچ و فہم پر گرفت یا ردعمل سے پرہیز کی روایت ہمارے یہاں اب بھی قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کے بیشتر ابتدائی ناول نگاروں نے عشق کا بیان بڑے بھونڈے طریقے سے کیا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف ناول کا حسن متاثر ہوا بلکہ بعض اوقات اس کی ہیئت تک مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اس زمانے میں بعض ایسے عمدہ اور اعلیٰ پایے کے ناول بھی لکھے گئے جن میں حسن و عشق کا تذکرہ بڑی خوبی اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ مثلاً مرزا محمد ہادی رسوا کا'' امراؤ جان ادا'' اور عبدالحلیم شرر کا'' فردوس بریں'' وغیرہ۔

کردار نگاری کے حوالے سے یلدرم ایک بڑی اہم بات ناول میں ہیرو کی تبدیلی کی کرتے ہیں اور اس روش کو عام کرنے کے لیے شاہزادوں، نوابوں اور امیرزادوں کے بجائے وہ غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی ناول کا ہیرو بنانے اور ان کی زندگی پر مبنی ناول لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں:

''ایک اور بات جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے ابھی تک توجہ نہیں کی.....یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ امیر ہونا کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے جتنا کہ تعلیم یافتہ یا امیر.....مگر ہمارے ناول نویسوں نے خیال کر لیا کہ ہیرو کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو، نواب زادہ ہو، شاہزادہ ہو، یا کم سے کم معقول آمدنی رکھتا ہو.....ابھی تک اردو میں غریب کی زندگی کا نقشہ کھینچا جانا باقی ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق ناول لکھے جائیں۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر ابھی تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔''

قابل توجہ بات ہے کہ جس شخص کو آج تک رومان پرست یا فرار پسند سمجھا جاتا ہے وہ ترقی پسند تحریک کی تخم ریزی سے تقریباً 38 سال پہلے غریبوں اور غیر اہم سمجھے جانے والے لوگوں کے نہ صرف احوال و کوائف سے متعلق معلومات، وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کی ضرورت پر زور دے رہا ہے، بلکہ ان کی زندگی پر مبنی ناول لکھنے اور انھیں ناولوں میں بطور ہیرو پیش کیے جانے کی وکالت بھی کر رہا ہے۔

یلدرم ناول کی طرف عوامی رجحان، اس کی مقبولیت کے اسباب اور اس کے منصب سے متعلق اپنے نظریے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"پھر کیا وجہ ہے کہ افسانہ نگاری روز افزوں ترقی پر ہے؟ اس کی ایک بہت معقول وجہ بتائی گئی ہے کہ انسان کسی نہ کسی حد تک یونان کے فلاسفر اریس ٹپس یا اپی کیورس کا پیرو ہے، جن کا یہ قول ہے کہ اصل مقصد زندگی کا خوشی ہے اور شوقیہ کتابوں کے پڑھنے والے بھی عموماً اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ وہ جب کسی کتاب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انھیں لطف حاصل ہو۔ ایسے نفوس قدسیہ شاید لاکھ میں چار بھی نہیں ہوتے جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرتے ہوں اور جو ایسے ہیں وہ بھی محض خوشی کے بندے ہیں اور چونکہ علوم میں لطف حاصل کرنے کے لیے محنت اور کاوش کی ضرورت ہے، اس سے بچنے کے لیے وہ لوگ جو کتابوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، قصوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔"

بات قدرے منطقی انداز سے کہی گئی ہے کہ اپی کیورس کے مطابق انسانی زندگی کا مقصد حصول مسرت ہے جس کا ایک عمدہ طریقہ مطالعۂ کتب ہے۔ پھر مطالعے کی دو نوعیتیں ہیں: اول لطف اندوزی، دوم تحصیل علم۔ ثانی الذکر کے قاری کو یلدرم 'نفوس قدسیہ' کے لقب سے نوازنے اور ان کی تعداد لاکھ میں بمشکل چار بتا کر ان کے مطالعے کا لازمی نتیجہ بھی مسرت و خوشی کو قرار دیتے ہیں۔ (ممکن ہے ان کی مراد حصول علم کا شوق یا سیرابی علم کی سرخوشی ہو) دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ علمی کتابیں پڑھنے کے لیے چونکہ محنت و توجہ درکار ہے اس لیے لوگ قصے کہانیوں کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ بعینہ یہی خیال یلدرم سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کا تھا، جنھوں نے علوم کو قصے کے فارم میں ڈھالنے کی بنیاد ڈالی۔ گویا سجاد حیدر یلدرم کے نزدیک قصہ مشکل، خشک اور ادق علم کی تحصیل سے فرار حاصل کرنے والوں کے لیے جنت نما جزیرہ اور ذریعۂ لطف و انبساط ہے۔ تاہم وہ لطف و انبساط کے حصول میں بے راہ روی کے قائل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ لوگوں میں مسرت و خوشی حاصل کرنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے جس کی تکمیل کے مختلف ذرائع میں سے ایک عام ذریعہ قصہ ہے۔" اس لیے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس کا استعمال اچھا ہو۔" یہاں یلدرم براہ راست یا بالواسطہ اس صنف پر نظریات و عقائد یا مفید اور کارآمد علوم و فنون کی اشاعت و تبلیغ کی ذمے داریوں کا بار ڈالنے کی بات تو نہیں کرتے جیسا کہ بعد کے بعض ناقدین و مصنفین نے اس سے مطالبہ کیا ہے، لیکن وہ اس جانب ضرور اشارہ کرتے ہیں کہ ناول کا اپنا ایک خاص مذاق و معیار اور منصب ہوتا ہے جسے بہر حال لغو اور مہمل نہیں ہونا چاہیے۔

یلدرم کا یہ مضمون اس اعتبار سے بے حد اہم اور لائق توجہ ہے کہ انھوں نے اس میں ناول کی مختلف اقسام و معیار کی وضاحت کی ہے، اس کی فنی خصوصیات، موضوعات اور اس کے منصب و منہاج پر روشنی ڈالی ہے، پہلی بار انھوں نے ناول کے کردار میں تبدیلی کا سوال اٹھایا ہے اور اس میں اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے علاوہ عام اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگی کی پیش کش کی وکالت کی ہے۔ نذیر، شرر اور سرشار کے ادبی اور فنی مرتبوں کے تعین کی کوشش کی ہے اور ناول نگاری سے متعلق چند جدید اور مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ سو کہنا چاہیے کہ اردو فکشن کی تنقید میں یلدرم کا یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور تنقید کی تاریخ میں ان کو ایک اہم مقام دلاتا ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu,
Delhi University, Delhi-110007

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے "اکبرنامہ" کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی "منتخب التواریخ" (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو "اکبرنامہ" سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

روپ کرشن بھٹ

اردو اور تعلیمِ بالغاں

تعلیم بالغاں کا تصور یوں تو دنیا میں کافی پرانا ہے لیکن انیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم بالغاں کے کئی ادارے قائم کیے گئے۔ ہندوستان میں بھی اسی دوران بہت سی غیر سرکاری، مذہبی اور سماجی تنظیموں نے تعلیم بالغاں کی طرف توجہ دی اور کئی اسکول اور ادارے بھی کھولے گئے۔

اگر تحریکِ آزادی کو موجودہ دور کی سب سے کامیاب تعلیم بالغاں کی مہم کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دراصل تحریک آزادی کے دوران ہی ہمارے سیاست دانوں اور رہنماؤں نے اپنی تقریروں اور نعروں سے لوگوں کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے کے لیے تیار کرتے ہوئے ان کو ہم رائے بنایا، اکٹھا کیا اور ان کو سماجی، سیاسی فرائض اور حقوق سے آگاہ کیا۔ چونکہ آزادی کی یہ جنگ اردو میں ہی لڑی گئی اس لیے تحریک آزادی کے ساتھ ہی صحیح معنوں میں اردو اور تعلیم بالغاں کا رشتہ قائم ہوا۔

یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ آزادی کے بعد جب پہلی مردم شماری 1961 میں کرائی گئی تو ہندوستان کی خواندگی کی شرح صرف 18 فیصد تھی۔ تب سے اب تک مختلف پالیسیوں، پروگراموں اور منصوبوں کے تحت تعلیم بالغاں کے میدان میں بہت کچھ کیا گیا اور انھی کوششوں کی بدولت 1988 میں قومی خواندگی مشن (NLM) بنایا گیا اور ایک طے شدہ پروگرام کے تحت تعلیم بالغاں کی مہم سارے ملک میں چلائی گئی۔ اس کام میں سرکار اور سرکاری تنظیموں کے علاوہ، غیر سرکاری تنظیمیں، سماجی اور مذہبی رہنما پیش پیش رہے۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں تعلیم بالغاں/خواندگی کی صورت حال کچھ اس طرح ہے:

1. ملک کی کل شرح خواندگی %64.84 فیصدی ہے۔
   مردوں کی 75 فیصدی اور عورتوں کی 53 فیصدی۔
2. 1991 سے 2001 تک مردوں کی خواندگی میں 11 فیصدی اور عورتوں کی خواندگی میں 14 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔
   مردوں اور عورتوں کے درمیان خواندگی کا فاصلہ 3 فیصدی کم ہوا ہے۔
3. NLM کے وجود میں آنے کے بعد سے ایک کروڑ 24 لاکھ لوگوں کو خواندہ بنایا گیا ہے۔
4. تعلیم یافتہ لوگوں میں عورتوں کی کل تعداد 60 فیصد ہے۔
   23 فیصدی SC اور 12 فیصد ST۔

اردو اور تعلیم بالغاں— 2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ایک سو دو کروڑ ستاسی لاکھ ملین ہے جس میں اردو والوں کی تعداد لگ بھگ 5 فیصدی ہے۔ اس طرح قومی سطح پر اردو بولنے والوں کا مقام چھٹا یعنی ہندی، بنگالی، تیلگو، مراٹھی اور تامل کے بعد ہے۔ یہ تعداد پانچ کروڑ سے کچھ زیادہ ہے۔

مذہب کی بنیاد پر اگر دیکھا جائے، تو مسلمانوں میں خواندگی کی شرح سب سے کم یعنی صرف 59 فیصدی ہے جو کہ قومی سطح سے بہت کم ہے۔ حالانکہ اردو تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے پھر بھی ملک کے مختلف علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اردو میں دلچسپی ہے۔

اردو میں تدریسی مواد— NLM نے تعلیم بالغاں کے لیے کتابیں اور دیگر تدریسی مواد بنانے کا ذمہ زیادہ تر State Resource Centres کو دیا ہوا ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے یہ ذمے داری ان تمام SRCs کو دی گئی ہے جہاں کہ اردو بولنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی بھارت سرکار نے ایک SRC قائم کیا ہوا ہے اس مرکز نے اردو میں سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ حالانکہ SRC Deepayatan پٹنہ، SRC حیدرآباد اور SRC سرینگر نے بھی بہت ساری کتابیں اردو میں تیار کی ہیں لیکن سب سے زیادہ اردو کے پرائمر اور دیگر کتابیں SRC جامعہ نے ہی تیار کی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے پرائمر کرناٹک، مہاراشٹر، بہار، مغربی بنگال وغیرہ ریاستوں میں بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پچھلے کچھ سالوں میں SRC جامعہ نے لگ بھگ دس لاکھ اردو پرائمر لگ بھگ 13 ریاستوں میں مہیا کرائے ہیں۔

پرائمروں کے علاوہ نوساکشر د (نوخواندہ) لوگوں کے لیے تعلیم بالغاں کے ڈائرکٹریٹ کی نگرانی اور تعاون سے بہت سارے مضامین پر اردو میں کتابیں لکھوائی گئی ہیں۔ جو PL اور CE Stage پر استعمال کی جاتی ہیں۔

بالغوں کے لیے لازمی ہے کہ تدریسی مواد دلچسپ اور جانکاری بڑھانے والا ہو۔ پیشے سے متعلق جانکاری ہونا ضروری ہے۔ کسانوں کے لیے،

پچھلے سال جامعہ میں ہی DAE نے اس طرح کی کتابوں کے ریویو کے لیے ایک بڑے پیمانے پر ایک workshop کرائی تھی جس میں اردو زبان کی سینکڑوں کتابیں شامل تھیں۔

کچھ ماہ پہلے DAE نے چنڈی گڑھ میں ہریانہ اردو اکادمی کے تعاون سے ایک workshop منعقد کی تھی جس میں اردو کی بہت ساری کتابیں تیار کرلی گئیں۔

اردو والوں تک پہنچنے کے لیے NLM نے SRC جامعہ میں 1999 میں ایک "اردو سیل" قائم کی تھی۔ اس Cell کا کام تھا اردو میں کتابیں بنانا اور ان تمام NLM Documents کا جو انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں چھپے ہوئے تھے، اردو میں ترجمہ کرنا۔ اس سیل نے بڑی تعداد میں کتابوں اور NLM Documents کا اردو میں ترجمہ کیا اور "شام نو" کے نام سے اردو میں ایک میگزین بھی نکالا۔

اردو اکادمیوں سے تعاون — SRC جامعہ دہلی اردو اکادمی کے تعاون سے بھی اردو والوں میں تعلیم بالغاں کے لگ بھگ 150 سینٹر دہلی میں چلا رہی ہے جن میں ہر سال لگ بھگ چار ہزار لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دیگر صوبوں میں بھی اردو اکادمیوں کے ساتھ کئی مشترکہ پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں جیسے ہریانہ، بہار، حیدرآباد وغیرہ۔ DAE/ALM مختلف مقامات پر اردو ادیبوں اور اردو صحافیوں کے لیے بہت سے workshop, seminar وغیرہ کرتی رہتی ہے۔ NLM نے ایک قومی سطح کی NLM Conference، SRC جامعہ کے تعاون سے بھی کچھ سال پہلے کرائی تھی جس کا مقصد خواندگی کے فروغ کے لیے اردو پریس کا تعاون حاصل کرنا تھا۔

اردو ماہرین اور خواندگی ورکرز کی ٹریننگ — اردو علاقوں میں کام کرنے والے خواندگی مہم کے جتنے بھی کارکن ہیں ان کے لیے SRC, NLM کے تعاون سے مختلف training Programme کراتی رہتی ہے۔ جن میں teaching learning کے طریقوں سے لے کر سماجی اقدامات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور لوگوں کو سماجی، معاشی، سیاسی اور سرکاری ضرورتوں سے آگاہ کرایا جاتا ہے۔

تعلیم بالغاں کے میدان میں اردو زبان کے تعلق سے بھی باقی زبانوں کی طرح وقتاً فوقتاً کافی تحقیقی کام کیا جاتا ہے۔

مستقبل کے منصوبے — گیارہویں منصوبے کے تحت اردو والوں کے لیے NLM نے مندرجہ ذیل اقدامات کا ارادہ کرلیا ہے۔

i. ملک کے 88 اقلیتی ضلعوں میں خواندگی کی مہم از سر نو زور و شور سے چلائی جائے گی۔

ii. اردو علاقوں میں J.S.S. کھولے جائیں گے جن میں نوخواندہ لوگوں کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے تربیتی تعلیم دی جائے گی۔ ان اداروں میں لگ بھگ تین سو سے زیادہ ہنر سکھائے جاتے ہیں۔

iii. انگریزی اور ہندی میں حال ہی میں رائج کیے گئے تمام Documents کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے گا۔

iv. اردو علاقوں میں ادیبوں، ماہرین تعلیم اور میڈیا کے لیے تعلیم بالغاں سے جڑے رہنے کے مقصد سے workshop اور seminar کرائے جائیں گے۔

اسلام اور تعلیم بالغاں — تعلیم سے متعلق پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی ہدایات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مسلمان بخوبی واقف ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے، اور حضرت محمدؐ کا ایک مشہور فرمان ہے کہ "علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے"۔ حضرت محمدؐ کی ایک اور حدیث یہ ہے کہ "علم حاصل کرو ماں کی گود سے قبر تک۔" قرآن شریف کی پہلی سورہ جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی "اقرا" یعنی "پڑھو" سے شروع ہوئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سال دو ہجری میں جنگِ بدر کے بعد بہت سے غیر مسلم قیدی گرفتار ہو کر آئے تو حضرت محمدؐ نے ان کی رہائی کی یہ شرط لگائی کہ ہر قیدی ایک مسلمان کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ اس طرح سینکڑوں قیدیوں کو رہائی ملی اور سینکڑوں مسلمان تعلیم یافتہ ہوگئے۔ اس سے آج کل کا NLM کا نعرہ یعنی Each one teach one ذہن میں آتا ہے۔

حضرت محمدؐ نے عورتوں کی تعلیم پر بھی بہت زور دیا۔ اسلام کی تواریخ میں عورتوں کی تعلیم کا پہلا مدرسہ حضرت محمدؐ کی شریکِ حیات حضرت عائشہؓ کا "حجرہ" یعنی کمرہ تھا۔ یہاں حضرت محمدؐ بھی ہفتے میں ایک بار عورتوں سے مخاطب ہوتے تھے۔

NLM نے مسلمانوں خاص طور پر مسلمان عورتوں کو ساکشر بنانے کے لیے اماموں، مسلم خطیبوں، دانشوروں اور عالموں کی امداد وقتاً فوقتاً لی ہے۔ نتیجے کے طور پر بہار کے کشن گنج، ارریا، پورنیا میں مسلم عورتوں نے کافی تعداد میں تعلیم بالغاں کی مہم میں زور شور سے حصہ لیا۔

موجودہ سرکار میں پرائم منسٹر کے مسلم اقلیتوں کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت بھی NLM کافی اقدامات کر رہی ہے۔

NLM نے اردو کے لیے ایک صلاح کار بھی رکھا ہے، جو سرکار کو اردو والوں میں تعلیم بالغاں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لیے صلاح دیتا رہتا ہے۔

(نوٹ: یہ پرچہ سرسید فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ قومی سیمینار بعنوان "اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے مسائل" جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں 18-20 جولائی 2008 کو پیش کیا گیا۔) ▢▢▢

پتہ:
Director National Literary Mission
10-Jamnagar House, ShahJahan Road,
New Delhi-110011

وارث علوی

احمد فراز — چند یادیں

احمد فراز — نام بہت سنا تھا۔ کلام بہت کم پڑھا تھا۔ لکھنؤ کے ایک پروگرام میں ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ویسے بھی نقاد اور شاعر کی ملاقات قرآن السعدین تو شاذ ہی ہوتی ہے اس شبھ گھڑی کے نہ آنے کی نہ احمد فراز کو خبر تھی نہ مجھے افسوس۔

احمد فراز سے میری پہلی ملاقات جو آخری بھی ثابت ہوئی دوحہ قطر میں آج سے قریباً تین ماہ قبل یعنی 16,15 مئی 2008 کو دوحہ قطر میں ہوئی جہاں ہندوستان سے اس خاکسار کو اور پاکستان سے مشہور افسانہ نگار محمد منشا یاد کو انعامات سے نوازا گیا تھا۔ اس تقریب میں مشاعرے کی صدارت احمد فراز نے کی جو براہ راست امریکہ سے پاکستان اور پاکستان سے دوحہ آگئے تھے۔ اس عمر میں بھی دل کش چہرے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ چہرے پر آثار سفر کے ہیں یا سرور کے۔ پہلے تو میں پہچان نہیں سکا کہ یہ آدمی جو اتنا چہک رہا ہے کون ہے۔ لیکن پھر بغیر تعارف کے قرائن سے ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ پھر تو ان کے ساتھ دو شامیں نہایت پرلطف اور رنگین گزریں۔ محفل ساز آدمی تھے۔ لطائف کا خزینہ، قہقہوں کا پٹارا۔ اپنی دلچسپ باتوں میں سیاست تو کیا ادب کو بھی داخل ہونے نہیں دیا کیونکہ ادب کی بھی اپنی سیاست ہے جو آج دونوں ملکوں میں بہت منہ زور ہے اور اندیشہ رہتا ہے کہ اگر ایک بار داخل گفتگو ہو گئی تو قلقل مینا کی بجائے جوتیوں میں دال بٹنے لگے گی۔ بہر حال یہ دوحہ کی ملاقاتیں اتنی گوہر ریز دگوہر بیز تھیں کہ مجھے احمد فراز بھا گئے۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ موت بھی ان کی گھات میں تھی۔ وہ انھیں کھا گئی۔ قدرت نے احمد فراز کو شہرت، مقبولیت، ملکوں کے سفر، مشاعروں، معاشقوں اور رفاقتوں سے ایسا نوازا تھا کہ لگتا تھا ملہم غیب کی طرف سے یہ نوازشیں ان پر ان کے اشعار کی طرح بغیر کسی کاوش کے نازل ہوتی رہتی ہیں اس لیے محفل ادب میں جب بھی ان کی شاعری کی جوانی کا ذکر چھڑتا تو بات پہنچتی قیامت تک جو اس زمانے میں فیض سے عبارت تھی، اور اس زمانے میں ہم فیض کے ایسے پرستار تھے کہ ان کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لینا چاہے وہ اثرات کے ذیل میں ہی کیوں نہ ہو، ہمارے لیے کفر و زندقہ تھا۔ فیض کے تعلق سے ہمارا عقیدۂ احدیت اس غلو کو پہنچا ہوا تھا کہ خود فیض احمد فیض کے نام میں بھی ہمیں ایک ہی فیض قبول خاطر تھا۔

بہر حال یاروں نے احمد فراز کی شاعری کا ایک سادہ فارمولا ڈھونڈ نکالا، غزل میں وہ فیض اور نظم میں وہ احمد ندیم قاسمی کی پیروی کو مباح سمجھتے تھے۔ آکسیجن ہائیڈروجن کا یہ فارمولا بتاتا تھا کہ احمد فراز کتنے پانی میں ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ خود غزل کی صنف میں شاعر کو مطلع سے لے کر مقطع تک تکا بوٹی کرنے والا ایسا بارود بھرا ہوتا ہے کہ اگر وہ دوسرا مشاعرہ پڑھتا ہوا نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ یہ اس کا بھوت نہیں، وہ خود ہے، وہ زندہ رہ گیا ادب میں، بارود کے باوصف، کچھ اپنی خلقی صلاحیت اور کچھ کسی کی چشم فیض کے سبب۔

مقبولیت کی صفت دو دھاری تلوار ہے۔ یہ شاعر کا اعتراف ہے شاعری کا نہیں۔ نقد کی بلند بینی نے احمد فراز کے ساتھ یہ ظلم روا رکھا ہے کہ چاہے وہ موت کی سرحد سے گزر جائے وہ اس لکشمن ریکھا کو کبھی پار نہیں کر سکے گا جو ناقدانہ فرعونیت نے مقبولیت اور فنکاری کے بیچ کھینچ رکھی ہے۔

بہت سے نااہل شاعروں کے مقابلے میں جنھیں نقادوں نے بانس پر چڑھایا ہے احمد فراز کے یہاں غزل کے دلپذیر اشعار کی تعداد ان کے ڈیڑھ سو صفحات کے مجموعے سے کہیں زیادہ نکلے گی، اور جہاں تک نظموں کا تعلق ہے احمد فراز کے یہاں حسن و محبت کی خوبصورت رومانی نظموں کے علاوہ عصری شعور کی حامل باغیانہ، انقلابی اور انسان دوست نظموں کی کمی نہیں۔ احمد فراز نے بڑی جرأت سے آمریت، جبر، ظلم، اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس کی انسان دوستی کسی آئیڈیولوجی کی مرہون منت نہیں بلکہ ایک دردمند دل کی بے ساختہ پکار ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ بڑی بڑی زبانوں کے بڑے بڑے دانشور شاعر اور ادیب فاشسٹ جماعتوں اور آئیڈیولوجی کے زرخرید ہر کارے اور پرچارک بنے ہوئے ہیں۔ احمد فراز کی للکاریں، اس کی چیخ پکاریں صدیوں کی کچلی ہوئی انسانیت کی فریاد و فغاں ہیں۔ اس کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین تو ہونا ابھی باقی ہے۔ ابھی تو میں صرف ان راتوں کی صحبتوں میں احمد فراز کو دیکھ رہا ہوں جو ایک خوش طبع، روشن ضمیر اور معجز بیان شاعر کی باتوں سے چہک بھی رہی تھیں اور مہک بھی رہی تھیں۔ میری دعا ہے کہ اس کا راہِ عدم کا سفر بھی تجلیوں سے جگمگاتا اور خوشبوؤں سے مہکتا رہے۔

□□□

184-Syed Wada,
Astodia, Ahmadabad,
Gujrat

مظہر امام

کچھ احمد فراز کے بارے میں

کسی ہم عصر کے بارے میں لکھتے ہوئے معروضیت کو پوری طرح راہ دینا ایک مشکل مرحلہ ہے، کیوں کہ اس عمل میں اپنی ذات کے غیر ضروری طور پر ''ملوث'' ہونے کا احتمال رہتا ہے، اور خصوصاً ایسے ہم عصر کے بارے میں جس سے قربت کے مواقع بھی میسر آئے ہوں۔ میں نے دوردرشن نیشنل چینل کے لیے ان کا ایک انٹرویو بھی لیا تھا، اور انجمن ترقی اردو دہلی کی جانب سے ان کے اعزاز میں جو جلسہ ہوا تھا، اس کی مجلس صدارت میں بھی شامل تھا۔

ناصر کاظمی نے بہت پہلے ایک مضمون ''میرا ہم عصر'' کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں وہ کہتے ہیں:

''ہم عصر کی پہچان تو یہ ہے کہ وہ ادب کو ترقی کا زینہ نہ سمجھے اور ترقی نہ ملے تو اسے درویشی نہ کہے۔ یعنی شاعری ذریعۂ عزت بن کر نہ رہ جائے اور درویشی مجبوری کا دوسرا نام نہیں۔''

عنوان کی مجبوری کے تحت شاید یہاں لفظ ''ہم عصر'' استعمال ہوا ہے، ورنہ دراصل ہر جینوئن ادیب اور شاعر کے لیے یہ بیان درست ہے۔

ناصر کاظمی کا یہ بیان پڑھتے ہوئے مجھے اکثر احمد فراز یاد آتے ہیں۔ اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود وہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت بھی رہے ہیں۔ وہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ شاعر کہلائے اور establishment سے ان کا قریبی تعلق بھی رہا۔

احمد فراز غیر منقسم ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نوشہرہ میں 14 جنوری 1931 کو پیدا ہوئے۔ (بعض جگہ ان کا سنہ پیدائش 1933 ملتا ہے، جو درست نہیں۔) ابتدائی تعلیم کوہاٹ میں حاصل کی، ایڈورڈ کالج پشاور سے بی۔اے کیا، اور پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں ہی شاعری شروع کی۔ مختلف ملازمتیں کیں۔ پہلے ریڈیو پاکستان پشاور سے وابستہ ہوئے، پھر وہیں کے اسلامیہ کالج میں لیکچرار ہوئے۔ بعد میں کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ''پاکستان نیشنل سنٹر''، ''اکادمی ادبیات پاکستان''، ''لوک ورثہ پاکستان'' اور ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کی سربراہی کی۔

احمد فراز کتنے بڑے شاعر تھے، اور تاریخ ادب میں ان کا کیا مقام ہوگا، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا، لیکن اس میں اختلاف رائے نہیں کہ احمد فراز اپنے وقت کے مقبول ترین شاعروں میں تھے، اور فیض کے انتقال کے بعد تو یہ مقبولیت اور بڑھ گئی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں جو شعرا بلند منصب پر فائز ہوئے، ان میں ناصر کاظمی، ابن انشا، شکیب جلالی اور احمد مشتاق کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں احمد فراز بھی ہیں، گرچہ ان کی عمروں میں تفاوت ہے۔ ناصر کاظمی کا سنہ پیدائش 1925، ابن انشا کا 1927، شکیب جلالی کا 1934 اور احمد مشتاق کا 1933 ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا احمد فراز 1931 میں پیدا ہوئے تھے۔

میں نے احمد فراز کے جن چار ہم عصروں کے نام لیے ہیں، تاریخ ادب میں ان کا مرتبہ مستحکم ہے۔ احمد فراز کے بارے میں ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کی مقبولیت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں اور یہ مقبولیت مشاعرے کے شاعروں والی مقبولیت نہیں ہے، ہر چند احمد فراز مشاعروں کے بھی بہت مقبول شاعر رہے ہیں، اور شاید اسی لیے ساقی فاروقی کے طنز وتشنیع کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ وہ عوام ہی نہیں، خواص میں بھی مقبول ہیں، ان کے بھی پسندیدہ شاعر ہیں، محبت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب ادبی اور شعری ذوق غیر منقسم ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بڑی یکسانیت اور قربت رکھتا تھا۔ مثلاً میں نے اپنی نوعمری کے دنوں میں اب سے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے اپنے شہر دربھنگا میں جو طرحی مشاعرے دیکھے ہیں، ان میں سے کئی وہ زمینیں بھی تھیں جن میں احمد فراز کی غزلیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

یا

قربتوں میں بھی جوانی کے زمانے مانگے

احمد فراز کے معترضین کہتے ہیں کہ وہ تین چار غزلوں کے شاعر ہیں، اور ان غزلوں کی مقبولیت میں ان اشعار سے زیادہ مہدی حسن اور دوسرے گلوکاروں کی آواز کا دخل ہے۔ ان کے یہاں ناہمواری کی تلاش بھی کی گئی ہے۔ ان کی ایک غزل میں اس شعر:

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصال یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

کے فوراً بعد یہ شعر ملتا ہے:

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب، کبھی بنام وطن

ان کے یہاں ثقیل یا نامانوس الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی مشہور نظم "محاصرہ" میں:

معززین عدالت حلف اٹھانے کو
مثال سائل مُبرم نشستہ راہ میں ہیں

"شترگربہ" کا عیب شاعر کو قابل قبول بننے سے بھی محروم کر دیتا ہے، پھر بھی آج کی شاعری میں یہ عیب اکثر مل جاتا ہے، کیوں کہ اب شعرا پیدائشی "فارغ التحصیل" ہوتے ہیں۔ احمد فراز کے مشہور شعر:

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

میں "ہم" اور "مجھ" کے استعمال سے "شتر گربہ" کا التباس ہوتا ہے اور اس پر اعتراض بھی کیا گیا ہے، لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ پہلے مصرعے میں "ہم" عاشق اور محبوب دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (یعنی دونوں کس کس کو جدائی کا سبب بتائیں گے) اور دوسرے مصرعے میں "مجھ" صرف عاشق کے لیے۔

میں نے غالب پر ایک سخن گسترانہ مضمون لکھتے ہوئے چند اشعار کے حوالے سے کہا تھا:

"غالب کے یہ اشعار اپنے اسلوب، اپنے مزاج، اپنی مخصوص معنویت اور الفاظ کے دروبست سے نہیں پہچانے جاتے، بلکہ اپنی شہرت سے پہچانے جاتے ہیں۔"

میں یہی بات احمد فراز کے سلسلے میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے مشہور اشعار اپنی مخصوص معنویت، اپنے مزاج اور الفاظ کے دروبست سے نہیں، بلکہ اپنی شہرت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے چند مشہور شعروں کو پیش نظر رکھیے۔ "کس کس کو بتائیں گے....." والا شعر اوپر درج ہوا۔ کچھ اور شعر دیکھیے:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے سوکھے ہوئے کچھ پھول کتابوں میں ملیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ روٹھ جائے اگر یاد کچھ دلاؤں اسے

کچھ فنی باتوں کا ذکر اپنی جگہ، واقعہ یہ ہے کہ احمد فراز بڑی خوبیوں کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں شگفتگی اور نکھار کی سی کیفیت ہے۔ ان کے اشعار بہ آسانی حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کسی شاعر کے کلام کا آسانی سے یاد رہ جانا، شاعر کی بڑائی کی دلیل نہ سہی، لیکن اس کا ایک وصف ضرور ہے۔ ذرا ایک تجربہ کر کے دیکھا جائے کہ آج کے کون کون شعرا ہیں، جن کا کلام لوگوں کی زبان پر بہ آسانی آجاتا ہے۔ فیض کو تو جانے دیجیے۔ کچھ لوگوں کو "نقش فریادی" اور "دست صبا" حفظ ہیں، لیکن ان کے بعد کے معدودے چند مقبول ترین شاعروں میں احمد فراز کا نام بلاتکلف لیا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام کی نغمگی فوری طور پر متوجہ کرتی ہے اور دل کو موہ لیتی ہے۔

احمد فراز کے طرز اظہار میں کوئی بناوٹ، کوئی تصنع نہیں۔ اپنی تمام تر ہردلعزیزی اور مقبولیت کے باوجود وہ اپنے اشعار میں کہیں اتراتے نہیں۔ ان کے کلام میں ایک فطری والہانہ پن اور ربودگی ہے۔ ان کی سادگی میں ایک ایسی پُرکاری ہے جو فوراً دامن دل کھینچتی ہے۔ ان کے برتے ہوئے الفاظ نرم، سبک، شگفتہ اور شاداب ہیں۔ ان کے لہجے میں ایک گداز اور نزاکت ہے۔ وہ عشق و محبت اور ہجر و وصال کے پیش پا افتادہ موضوعات میں تازگی اور دلکشی پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

احمد فراز کی احتجاجی اور باغیانہ شاعری کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر سا دور تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زوال کے بعد احمد فراز کو احساس ہوا کہ ان کا ستارہ گردش میں آسکتا ہے، اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے اور یورپ میں قیام پذیر رہے۔ اسے جلاوطنی کا نام دیا گیا۔ احمد فراز کی احتجاجی شاعری اسی دور کی یادگار ہے۔ احتجاجی شاعری کی ایک مثال ان کی نظم "محاصرہ" ہے، اس نظم میں بندوں کی ترتیب ویسی ہی ہے جیسی اکثر ترقی پسندوں خصوصاً ساحر لدھیانوی کی ہوا کرتی تھی۔ لہجہ بھی ساحر ہی کا اور ایک حد تک سردار جعفری سے ملتا جلتا ہے۔ چلتے چلتے احمد فراز کے کچھ عمدہ شعر:

اس نے سکوت شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہ تمام رکھ دیا
شکوۂ ظلمت شب سے تو یہی بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
دلوں کا قُرب کہیں فاصلوں سے مِلتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی!
خوشی کیا ہے گئی تو عمر بھر کو
گھڑی بھر کے لیے آئی تو آئی
تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اُداسی کا

□□□

پتہ:
176-B, Pocket-I,
Mayur Vihar, Phase-I,
Delhi-110091

فضیل جعفری

احمد فراز اور ان کی شاعری: جیسا کہ میں سمجھتا ہوں

احمد فراز کے انتقال کے بعد ہندوستان میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً جس گہرے رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ فطری بھی ہے اور مشرقی روایات کا مظہر بھی۔ کوئی انھیں اکیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر قرار دے رہا ہے جبکہ اس صدی کا ابھی صرف آغاز ہوا ہے تو کسی کا خیال یہ ہے کہ ان کا ثانی رہتی دنیا تک پیدا نہیں ہوسکتا اسی لیے میرے نزدیک کسی مقبول شاعر کی موت کے فوراً بعد اس کے بارے میں کچھ لکھنے سے گریز کرنا چاہیے تاوقتیکہ وہ شاعر فراق یا فیض نہ ہو۔ بصورت دیگر تنقیدی شعور پر سطحی جذبات غالب آجاتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ راقم کو احمد فراز سے ملنے یا دور و نزدیک سے ان کا دیدار کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوسکی، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے عہد خصوصاً پچھلے 25,20 برسوں کے بیحد مقبول بلکہ محبوب شاعر تھے۔ اس کا ایک سبب تو وہی صاحب ''آب حیات'' کا شہرۂ آفاق قول ہے کہ شہرت عام عطیۂ خداوندی ہوتی ہے اور دوسرا سبب پاکستانی گلیمر ہے۔ تیسرا اور زیادہ اہم سبب خود ان کی شاعری ہے۔

آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان کے برخلاف پاکستان کے تعلقات خلیجی ممالک اور مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ بہت ہی زیادہ خوشگوار اور مستحکم رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر امریکا، برطانیہ اور کینیڈا وغیرہ میں کھاتے پیتے غیر مقامی پاکستانی شہریوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً مشاعرے برپا کرتے رہتے ہیں۔ احمد فراز کے بغیر کوئی مشاعرہ مکمل اور کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چند ماہ قبل وہ واشنگٹن کے جس مشاعرے میں گئے تھے، جہاں وہ بیمار پڑ گئے وہ بھی پاکستانی ڈاکٹروں کی انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔

ہندوستان میں بھی احمد فراز بہت مقبول تھے۔ وہ ہر بڑے مشاعرے میں مدعو کیے جاتے تھے۔ میری رائے میں ہند۔پاک تعلقات پر سردار جعفری کی ''کون دشمن ہے'' سے بہتر نظم کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ اس موضوع پر احمد فراز نے بھی کئی نظمیں لکھیں جنھیں وہ ہندوستانی مشاعروں میں خاص طور سے پڑھتے تھے۔ جن لوگوں نے بھی ان نظموں کو غور سے سنا اور پڑھا ہے یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ ایسی ہر نظم میں ہندوستان کو جارح اور پاکستان کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ ایسا ہی تھا۔ ہندوستان کے بعض انگریزی اخبارات اور اردو رسائل میں فراز مرحوم کے انٹرویو شائع ہوتے رہے ہیں۔ جس انٹرویو میں بھی ان سے ہندوستان کے اردو شاعروں کے بارے میں سوال کیا گیا فراز نے ان کا ذکر خاصی حقارت کے ساتھ کیا۔

میں اسی سلسلے میں ایک مشہور پاکستانی کالم نگار کا ذکر کرنا چاہوں گا جو شاعر بھی ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری پر زیادہ سے زیادہ کلام موزوں ہونے کا الزام ہی لگایا جاسکتا ہے لیکن انھیں بھی اکثر ہندوستانی مشاعروں میں زحمت سخن دی جاتی ہے۔ موصوف نئی دہلی سے واپس جانے کے بعد بطور اصول ہندوستان کے خلاف دو ایک کالم ضرور لکھتے ہیں۔ انھوں نے احمد فراز کے انتقال کے بعد جو کالم لکھا ہے اس میں بھی ہند—پاک تنازعے کا خاصا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ہمارے پسندیدہ کالم نگار کے مطابق احمد فراز کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کشمیریوں کی ''جدوجہد آزادی'' کے بہت بڑے حامی تھے اور اس مسئلے پر کسی ہندوستانی وزیر سے ایک ٹی.وی. پروگرام میں الجھ بھی پڑے تھے۔

(واللہ اعلم)

●

آیئے اب احمد فراز کی شاعری پر بھی دو ایک باتیں ہوجائیں۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ فراز کی شاعری کو پڑھ کر حافظ و خیام کی یاد آجاتی ہے۔ یہ صاحب ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ میں ساقی فاروقی کے اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ فراز کی تمام شاعری فیض احمد فیض کی تقلید ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ فراز نے فیض سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی غزلوں میں مقتل، قاتل، زنداں، صلیب اور مقتول جیسے لفظوں کا بہ کثرت استعمال ملتا ہے۔ وسیع تر سیاسی اور سماجی پس منظر میں ایسے الفاظ و اصطلاحات کا جو تخلیقی استعمال فیض کی غزلوں اور نظموں میں ملتا ہے وہ ان کی انفرادی دولت ہے۔ فراز نے کافی نظمیں لکھی ہیں جن کا تعلق پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی زیادہ تر نظمیں ہنگامی نوعیت کی ہیں۔ اس سلسلے میں خود احمد فراز نے یہ بیان دیا تھا کہ چونکہ پاکستان میں ہمیشہ مارشل لا نافذ رہتا ہے اس لیے ان کی یہ نظمیں کبھی بھی پرانی نہیں ہوسکتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مارشل لا کے سہارے کوئی فنکار بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

احمد فراز بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ایک ایسی وسیع القلب اور مہربان صنف سخن ہے کہ ہر اچھے شاعر کو دس پانچ بہت اچھے شعر نکال لینے کا موقع عطا کرتی ہے۔ بعض اوقات لوگ شاعر کو تو بھول جاتے ہیں لیکن پھر بھی اس کے اشعار زندہ رہتے ہیں۔ احمد فراز نے بھی کچھ بہت اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ان کی دو غزلیں:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ، پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اور

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

واقعی بہت اچھی ہیں اور وقت کی کسوٹی پر پوری اتر چکی ہیں ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ غزلیں 65-1964 میں لکھی گئی تھیں لیکن آج بھی ان کے کئی اشعار زباں زد خاص و عام ہیں۔ اگرچہ ان غزلوں کو مہدی حسن، اقبال بانو اور ملکہ پکھراج وغیرہ نے گایا بھی ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان غزلوں کی شہرت متذکرہ گلوکاروں کی مرہون منت ہے۔ یہ غزلیں احساس کی بھٹی میں تپ کر نکلی ہیں۔ احمد فراز کی بعد والی غزلوں میں:

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس حد تک کہ آج بھی بہت سے موسمی پرندے اس پر چونچ مارتے رہتے ہیں۔ اس غزل کی زمین غالب کی ہے۔ فراز نے قافیہ 'کو' کے بجائے 'کے' استعمال کیا ہے۔ ویسے انھوں نے 'کو' کے ساتھ بھی ایک غزل لکھی ہے۔ جس کا مطلع یوں ہے:

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

اب غالب کا مطلع بھی پڑھ لیجیے:

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اس سے قطع نظر کہ فراز کے شعر کا دوسرا مصرعہ تقریباً مہمل ہے، غالب وہ شاعر ہے جس نے آج تک کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اس کی کسی زمین میں اس سے بہتر شعر کہہ کر نکل جائے۔ فراز صاحب چونکہ فیض کے بھی بڑے معتقد تھے اس لیے انھوں نے فیض کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کروگے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

اب اس کے مقابلے میں فیض کا شعر ملاحظہ ہو:

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

زمین، لہجے اور لفظیات کی یکسانیت کے باوجود فیض کے یہاں جو تہہ دار معنویت ملتی ہے اس کے سامنے فراز کا شعر بالکل کھوکھلا، سطحی اور کمزور نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ احمد فراز اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود حافظ و خیام تو کیا اپنے سینئر ہم عصروں ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے بھی آس پاس دکھائی نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ہو یا پاکستان، کہیں بھی کسی سنجیدہ اور باشعور نقاد نے ان کی شاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ احمد فراز کی زندگی میں "جان جاں" سے لے کر "مرے خواب ریزہ ریزہ" تک ان کے تیرہ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ اگر ان کے تیرہ شعر بھی کافی دنوں تک زندہ رہ جائیں تو بھی میرے نزدیک ان کا شمار کامیاب اور اچھے شعرا میں ہوگا۔ مجھے ان کے جو شعر بہت پسند ہیں ان میں سے دو پیش خدمت ہیں:

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طواف در و دیوار کرے ہے
محفل میں کل فراز ہی شاید تھا لب کشا
مقتل میں آج کا سر بھی اسی کا تھا

احمد فراز کی موت سے دوسروں کی طرح مجھے بھی بہت افسوس ہوا لیکن میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا کہ ان کے داغ مفارقت سے اردو شاعری میں کوئی ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو پُر نہیں ہو سکتا۔ اردو والے دراصل روایتی طور سے میت پر بے وجہ آہ و فغاں کے عادی بن چکے ہیں۔

□□□

پتہ:
60/2,C-Dheeraj Upwan, Opp. Siddarth Nagar,
Boriwali, Mumbai (East)-400066

لطف الرحمٰن

احمد فراز کی شعریات

فرازؔ ایرانی اور ہندوستانی جمالیات کے امتزاجی الہام کا نغمہ گر ہے۔ وہ رودکی سے بیدل و غالب تک تمام صنادید عجم کی عظیم الشان تخیلی روایات کا امین ہے تو دوسری طرف قلی قطب شاہ سے فیض و فراق تک تمام سخنواران پیشین کی جمالیاتی اقدار کا تخلیقی وارث۔ اس کی یہ خاکساری میرے دعوے کی دلیل ہے:

میر و غالب کیا کہ بن پائے نہیں فیض و فراق
زعم یہ تھا رومی و عطار بن جائیں گے ہم

عصری حسیات و کیفیات کے وجدانی عرفان نے ہند ایرانی کلاسیکی شعور کی ہم آہنگی سے اس کے شاعرانہ کردار کو پیمبرانہ معجزات کا حامل بنا دیا ہے:

کہ شاعری بھی تو جز و پیمبری ہے فراز
سو رنجِ خلق خدا صورت پیمبر کھینچ
مجھے تو ڈر ہے کہ شیخ حرم کے ہاتھوں سے
مری طرح کہیں رسوا رسول و رب بھی نہ ہوں

فراز کی شاعری عہد پیشیں کے جمالیاتی مزاج و معیار اور اسلاف کے فکر و ہنر کی حساس ذمے دار اور باشعور تخلیقی دستاویز ہے لیکن بنیادی طور پر اس کا تخلیقی تخیل بیدل، اقبال اور فیض کی جمالیاتی وراثت سے ہم سخنی کے مکالمے پر مبنی ہے۔ بیدل کا مشہور شعر ہے:

با اضطرابِ دل ز ہر اندیشہ فارغیم
آسائشے ست جنبشِ ایں گاہوارہ را

فراز کہتا ہے:

اے دل ترے سکوں سے تری رونقیں گئیں
دریا کا سارا حسن ہی طغیانیوں میں تھا

بیدل کا مشہور مطلع ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، در دل کشا بہ چمن در آ

فراز نے بیدل سے یہ زمین مستعار لی ہے۔ اس زمین میں بیدل کی متعدد غزلیں ہیں۔ فراز کہتا ہے:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

فراز نے ''بطرز بیدل'' ایک غزل کہی ہے جس میں بارہ اشعار ہیں۔ چند بطور نمونہ درج ہیں:

جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دل کشائے زخم ہے
جو نظر اٹھتی ہے گویا آشنائے زخم ہے
دیکھنا آئین مقتل، دلفگاراں دیکھنا
التفات تیغ قاتل، خوں بہائے زخم ہے
چارہ گر نے بہر تسکیں رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ
مہرباں ہے وہ مگر ناآشنائے زخم ہے
میری وحشت کب ہوئی رسوائے عریانی فراز
کل بدن پر پیرہن تھا، اب ردائے زخم ہے

بیدل سبک ہندی کا بے حد ممتاز اور اہم نمائندہ ہے۔ سبک ہندی کے شعرا نازک خیالی، مضمون آفرینی، مشکل پسندی، باریک بینی، پیچیدگی اور خیال بندی کے قتیل تھے۔ بیدل کی شخصیت جدلیاتی حرارت اور عارفانہ محویت کا متوازن امتزاج تھی، اس لیے اس کے یہاں اعتدال سے گریز کی مثالیں کم ملتی ہیں، پھر بھی غالب کو کہنا پڑا:

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

فراز، بیدل کی تخلیقی شخصیت اور شاعرانہ کردار سے بے حد متاثر رہا ہے لیکن اس کی پختگی فکر، نزاکتِ احساس، الہامی بصیرت اور تخیلی توانائی نے اسے رمی خیال بندی اور دور دراز کار مضمون آفرینی سے محفوظ رکھا۔ فراز نے بیدل سے وجدانی حرارت، عارفانہ بصیرت اور توانائی اظہار کا ہنر لیا، جس کو اقبال کی قربت نے روانی و برجستگی اور سادگی و پرکاری کا پُر اثر لہجہ عطا کیا۔ اقبال سے فراز کی جمالیاتی قربت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

دیکھ آ کر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو محمل بھی تو
(اقبال)

یونہی آئے نہیں ہیں کوچۂ چاک گریباں میں
مزاج دل، محبت کی ادا ہم بھی سمجھتے ہیں
(فراز)

اقبال کہتے ہیں:

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

فراز عصرِ حاضر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن
خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فراز
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

اقبال کہتے ہیں:

با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

فراز کہتا ہے:

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا
(اقبال)

دلقِ اویس و چادرِ زہرا کدھر گئی
دزدانِ نیم شب سے تقاضہ تو ہم کریں
(فراز)

اقبال کے دبستانِ سخن سے فراز نے ذات میں کائنات اور کائنات میں ذات کے عرفان کا سلیقہ سیکھا ہے۔ انسانی ضمیر کی دلآویز روایات اور انقلاب کی خوں چشیدہ اقدار کے تحفظ میں فراز نے اقبال کی کائناتِ سخن کی سیر ایک مخلص اور خود رفتہ سالک کی حیثیت سے کی ہے۔ اس کا یہ سفر سلوک کا سفر تھا جس کے زیرِ اثر فراز کی شاعری جینے کا سلیقہ اور مرنے کا قرینہ سکھاتی ہے۔ اس نے اپنی نظم "لب گویا" میں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جس خلوص اور والہانہ پن کا اظہار کیا ہے، وہ بذاتِ خود اس کے فکر و ہنر کا نقطۂ عروج ہے:

اک شاعرِ درویش و قدح خوار و خدا مست
میں کون جو لکھوں تری عظمت کے قصیدے
جبریل کے پر ہوں تو وہاں تک میں پہنچ پاؤں
آوازِ جہاں سے ترا سازِ ابدی دے
تو وہ ہے کہ الہام ترے حرف کو ترسے
میں وہ کہ مجھے طعن مری بے ہنری دے
تو جبرِ شہی میں بھی علمدارِ جنوں تھا
میں نالہ بہ دل ہوں کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے
دہلیز نشیں ہوں میں ترے کاخِ سخن کا
میں کون، مگر تو شرفِ ہم سخنی دے
دے اذن کہ میں تجھ کو بتاؤں کہ ترے بعد
جو حال ہوا ہے ترے خوابوں کے چمن کا
اغیار کے ہر وار کو ہم جھیل گئے تھے
ہر چند کہ چرچا تھا بہت دار و رسن کا
تو برشِ شمشیرِ حریفاں سے تھا بسمل
ہم کو ہے گلہ دشنۂ اربابِ وطن کا
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات
شیوہ ہے وہی گردشِ افلاکِ کہن کا
ناوک ہی رہا قسمتِ ہر دیدۂ بینا
نیزہ ہی مقدر رہا بے باک دہن کا
اے ہاتفِ اسرارِ بشر سن کہ ترے بعد
کس طرح ترے درس کی توہین ہوئی ہے
معنوں سے تہی کر کے ترے حرفِ خودی کو
شعروں سے فقط وعظ کی تزئین ہوئی ہے
تھی فقر و توکل کی مستی تری ہستی
یاں کذب و تصوف ہی کی تلقین ہوئی ہے
جو مشقِ ستم مشغلۂ اہلِ جفا تھی
وہ رسمِ ستم شہر کا آئین ہوئی ہے
دربار سے وہ رشتہ رہا مفتیِ دیں کا
منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوئی ہے
ہیں اب بھی وہی بندۂ مزدور کے اوقات
گو دولتِ اربابِ امارت ہوئی دو چند
ہے اوج پہ سرمایہ پرستی کا سفینہ
دریوزہ گرِ نانِ شبینہ ہے ہنرمند
پیغامِ مساوات کہ دنیا کے لیے تھا
واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند
مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہیں لیکن
منعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند
شاہد ہیں منگورہ کی چٹانیں کہ ہے بڑھ کر
خونِ رگِ انساں سے زمرّد کا گلو بند

یہ مہتر و نواب و خوانین و موالی
ہر جا پہ قدامت کے صنم اب بھی وہی ہیں
ہے رزقِ زمیں آج بھی دہقاں کا پسینہ
اندازِ قدح خواریِ جم اب بھی وہی ہیں
اک تو ہی نہ تھا جس پہ لگی کفر کی تہمت
ہم جیسے شہیدانِ ستم اب بھی وہی ہیں
اب بھی ہیں وہی اہلِ ہوس صاحبِ محفل
ہم دل زدگانِ شبِ غم اب بھی وہی ہیں
یہ فتویٰ فروش و تہی آغوش و عبا پوش
پیرانِ رفیقانِ حرم اب بھی وہی ہیں
جو حرفِ جنوں تو نے سکھایا وہ کہوں گا
اے حق کی علامت، مجھے توفیقِ نوا دے
دے بازوئے فرہاد کو وہ تابِ جسارت
جو طرّۂ دستارِ رقیباں کو جھکا دے
اب قافلۂ شوق نئی دھن سے رواں ہے
اب پیشِ نظر ہے، نئی منزل نئے جادے
اب کج کلہی سربگریباں نظر آئے
اب چاک ہوں ذرّوں سے ستاروں کے لبادے
ہر عہد کا نخچیر رہا ہے لبِ گویا
یہ عہد بھی منصور کو سولی پہ چڑھا دے

فراز کی شعریات کی تشکیل میں یہ نظم خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ فراز کی فکری و فنی فتوحات میں اقبال سے اس کی ہم سخنی کے مکالمے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نظم فراز کی باطنی در بدری، شعور کی گریہ وزاری اور ادراک کی شعلگی کی بہترین اور خوب صورت مصوری ہے جو فراز کی اپنی شعریات کی تشکیل میں سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔

بیدل اور اقبال کے بعد فراز کی شعریات کی تشکیل و ارتقا میں فیض کی رومانی انقلابیت نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ فیض کی اشتراکی و رومانی روایات کے تخلیقی شعور نے فراز کو داخلی واردات کی جمالیاتی مصوری اور عصری حسیات کی تخیلی پیکر تراشی میں رنگ و نور اور نکہت و نغمگی کے امتزاجی قرینوں کی آگہی بخشی ہے جس نے اس کی شاعری کو زندہ دھڑکتا ہوا، حساس تجربہ بنا دیا ہے۔ اس کے اشعار شریانوں میں خون کی سرکش روانی کی لے پر حزنیہ احساس کے تاروں کو اس طرح چھیڑتے ہیں کہ اشکوں کو اظہار کا بہانہ مل جاتا ہے۔ فیض کی خدمت میں اظہارِ عقیدت کی درج ذیل مثال دیکھیے:

بیادِ فیض

قلم بدست ہوں، حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دنیا کا تذکرہ لکھوں
لکھوں کہ تو نے محبت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں
جہاں یزید بہت ہوں، حسینؑ اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمیں کو بھی کربلا لکھوں
ترے بغیر ہے ہر نقش "نقشِ فریادی"
تو پھول "دستِ صبا" پر ہے آبلہ لکھوں
مثالِ "دستِ تہِ سنگ" تھی وفا ان کی
سو کس طرح انھیں یارانِ باصفا لکھوں
حدیثِ کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو قصۂ تعزیرِ ناروا لکھوں
جگہ جگہ ہیں "صلیبیں مرے دریچے میں"
سو اسمِ عیسیٰ و منصور جابجا لکھوں
گرفتہ دل ہے بہت "شامِ شہرِ یاراں" آج
کہاں ہے تو کہ تجھے حالِ دلبرا لکھوں
کہاں گیا ہے "مرے دل مرے مسافر" تو
کہ میں تجھے رہ و منزل کا ماجرا لکھوں
تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے "نسخہ ہائے وفا"
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں
"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
خدا نکردہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

فراز نے فارسی اور اردو کے صنادید غزل سے اپنی تخلیقی شخصیت کی تہذیب و تادیب میں مجاہدانہ یکسوئی، محویت اور استغراق سے کام لیا ہے جس کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ یہاں محض چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

میں نے بھی کیا قصد سفر کا کہ غزل میں
غالب سا طرح دار ہے رہبر مرے آگے
میر و انیس و غالب و اقبال سے الگ
راشد، ندیم، فیض سے رغبت کے رات دن
فردوسی و نظیری و حافظ کے ساتھ ساتھ
بیدل، غنی، کلیم سے بیعت کے رات دن

شیلے کا سحر، کیٹس کا دکھ، بائرن کی دھج
ان کافران عشق سے نسبت کے رات دن
تشکیک و ملحدانہ رویے کے باوجود
رومی سے والہانہ عقیدت کے رات دن

یہ اشعار فراز کی تخلیقی شخصیت کی ریاضت اور مشق و ممارست ہی کی طرف اشارے نہیں کرتے بلکہ اس کی اپنی شعریات کی تعمیر کے ابعاد و آفاق کے حوالے بھی ہیں، جنھوں نے فراز کے تخلیقی منشور کی الہامی تدوین کی ہے۔

فراز کی شاعری بتدریج ارتقائی مرحلوں سے گزری ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے ربع تک بھی حب الوطنی کو ایمان و ایقان کا درجہ حاصل تھا اور بڑی حد تک آج بھی ہے لیکن عظیم فن کار بہر حال انسانیت کا نغمہ گر ہوتا ہے۔ انسانی درد مندی کو اس کے جمالیاتی منشور میں نقطۂ پرکار کی مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ فراز نے بتدریج اپنے تخلیقی سفر میں یہ شعور و ادراک حاصل کر لیا تھا۔ ان کی کئی نظمیں اور متعدد غزلیہ اشعار اس کی شہادت کے طور پر پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں۔ ''خواب گل پریشاں ہے'' ان کا ایک اہم مجموعۂ کلام ہے جس میں ''انتساب'' کے عنوان سے درج نظم دعوت فکر و نظر دیتی ہے۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

یہ تحریریں
ہماری آرزومندی کی تحریریں
بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں
فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہوں
یہ تحریریں
اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا
شعر کے مداح
ہم پر تہمتیں دھرتے
ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں
یہ افواہیں
کسی پہلی نگارش میں
ہمیشہ کے لیے مرقوم ہو جاتیں
ہماری ہستیاں مذموم ہو جاتیں
نہیں ایسا نہیں ہوتا
اگر بالفرض ہوتا بھی
تو پھر ہم کیا
سبک سارانِ شہرِ حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟
سگانِ کوچۂ شہرت کے غوغا
کالے بازاروں کے دلّالوں سے ڈرتے ہیں
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں
بلا سے ہم اگر مصلوب ہو جاتے
یہ سودا کیا برا تھا
گر ہماری قبر کے کتبے
تمھارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے

ہند و پاک کے سیاسی تناظر اور اکیسویں صدی کے سیاق میں اس نظم کی اہمیت از خود روشن ہے۔ فراز کی نظم ''سرحدیں'' بھی ان کی وسیع المشربی، آزاد خیالی اور انسانیت دوستی کا ایک حسین استعارہ ہے۔ اس کے آخری دو بند ہیں:

روم کے بت ہوں کہ پیرس کی ہو مونالیزا
کیٹس کی قبر ہو یا تربتِ فردوسی ہو
قرطبہ ہو کہ اجنتا کہ موہنجوداڑو
دیدۂ شوق نہ محرومِ نظر بوسی ہو

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کیے ہیں یہ اثاثے سارے
کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے پیاسے

فراز کی نظموں میں ''نئی مسافت کا عہد نامہ''، ''ہم اپنے خواب کیوں بیچیں''، ''اے میرے سارے لوگو''، ''محاصرہ''، ''مت قتل کرو آوازوں کو''، ''ابو جہاد''، ''اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں''، ''ندیم آنکھیں، ندیم چہرہ''، ''چلو اس شہر کا ماتم کریں'' اور ''حرف کی شہادت'' وغیرہ خصوصی توجہ کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں فراز کی انسانیت دوستی، جمہوریت پسندی، وسیع المشربی اور انقلابی آرزومندی نے اکیسویں صدی کا ''عہد نامۂ وفا'' رقم کیا ہے اور یہی خصوصیت اس کی غزلوں کو جمالیاتی استحکام اور دل نشینی بخشتی ہے۔ مثلاً:

تو فقط دشنۂ نفرت ہی کو لہراتا رہا ہے
تو نے کبھی دشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا ہے
اے خدا آج اسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

یہ تو اک شہر جنوں ہے چاک داماں! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترک محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں
اوروں کے لیے سایۂ دیوار بنی تھی

دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازۂ آئینہ گراں کھینچتا ہے

چلی ہے شہر میں کیسی ہوا اداسی کی
سبھی نے اوڑھ رکھی ہے ردا اداسی کی

اب تو سب دشنۂ و خنجر کی زباں بولتے ہیں
اب کہاں لوگ محبت کے نصابوں والے

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہوجاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں

یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
راحتیں ایک سی، افسردگیاں ایک سی ہیں

فراز کا ہر شعر خواہ وہ کسی تجربے اور احساس کی تصویر کشی ہو، اپنا مخصوص جمالیاتی وجود رکھتا ہے۔ مضمون آفرینی، نازک خیالی اور تازہ گوئی اس کی استعارہ سازی میں اساسی کردار ادا کرتی ہے۔ فراز اپنی معنوی دنیا کی سیاحت کا انوکھا مصور ہے۔ اپنی باطنی کائنات کی خواب آگیں، حزنیہ مسرت کا نادر گلوکار، وہ تغزل کی غنائی کیفیت کا ترجمان ہے، وہ عشق محبت اور تعلق اور حسنِ محبوب کی دلآویز کیفیتوں کو رمز و ایما کے طلسمی پیرہن میں پیش کرتا ہے۔ وہ ''برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی'' کے عرفانی اظہار کا قتیل ہے۔ نظم ہو کہ غزل وہ عشق و محبت کی شائستہ روایات اور ثقافتی وقار و معیار کا ذمے دار اور فرض شناس نمائندہ ہے۔ اس اعتبار سے غزل کی قلمرو میں اس کا امتیاز سخنوری قائم و دائم ہے۔ یہ کمال گویائی غیر معمولی جمالیاتی استعداد اور وجدانی عرفان پر منحصر ہے۔ بلاشبہ فراز معجزات سخن کے ممبروں میں اپنی مخصوص جگہ رکھتا ہے۔ وہ بستانِ تازہ کا گل سرسبد بھی ہے اور گلستانِ رنگیں کا عندلیب خوش نوا بھی۔ وہ دریائے نطق کا وہ گوہر یکدانہ ہے جس نے ایک عالم سے مقبولیت و محبوبیت کا خراج وصول کیا ہے۔ اس کی مستی اندیشہ آزادی فکر و احساس کی زائیدہ و پروردہ ہے۔ فیض و فراق کے بعد کی نسل کے چند ممتاز شعرا میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ غزل میں عصری احساسات اور انقلابی رجحانات کی ہم آہنگی اور امتزاج کی بنیاد پر ایک نئی جمالیاتی روایت کی تشکیل کی طرف پیش قدمی کا سہرا فراز کے سر ہے۔ اس کی الہامی واردات کی تازگی و شگفتگی نے اسے ملک سخن کی خسروی بخش دی ہے۔ درج ذیل اشعار اس کی شہادت رکھتے ہیں:

تیری باتیں ہی سنانے آئے
دوست بھی دل ہی دکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

اب کسے وضع محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

دولت غم تو میسر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

زخم ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتا ہے، دل رفو بھی ہوجائے

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خد و خال بھی

جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اس کے بغیر کٹ گئے کس طرح ماہ و سال بھی

یہ کیا کہ اہلِ ہوس بھی سجائے پھرتے ہیں
دلوں پہ داغ جبیں پہ لہو ہماری طرح

ہمیں تھے جو ترے آنے تلک جلے ورنہ
سبھی چراغ سرِ رہ گزر نہ تھے ایسے

اقبال کے بعد فراق، فیض اور جمیل مظہری اور ان کے بعض معاصرین نے اردو غزل کو اظہار و احساس کی معراج سے ہمکنار کردیا تھا۔ اس کے آگے کی منزل ''فروغ تجلی بسوزد پرم'' کے مصداق تھی لیکن ناصر کاظمی، ابن انشا، شہریار، ندا فاضلی، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، بانی، حسن نعیم، ظفر اقبال، عرفان صدیقی اور کچھ دوسرے شعرا نے غزل کو نئی جمالیاتی جہتوں سے روشناس کیا۔ موضوعات کے تنوع، تجربات کی ندرت اور احساس و اظہار کی جدت کے لحاظ سے شعرا کے اس گروہ نے اردو غزل کے دامن کو موضوعی و معروضی سطح پر ایک جہانِ نو سے متعارف کرایا۔ فراز بھی ان شعرا کی صف میں امتیاز و انفراد رکھتا ہے کہ اس نے زخموں کی اس امانت کو اگلی نسلوں تک پہنچانے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا ہے۔

فراز کے بعض استعارے، تلمیحیں، علامتیں اور پیکر انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی احساسات اور آفاقی تجربات کے عکاس بن جاتے ہیں جس کے دائرۂ عمل میں عصری تہذیبی و ثقافتی انتشار و بحران اور معاشرتی اور سماجی کشمکش ابدیت کی سرحدوں سے متعلق ہو جاتی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فراز غیر معمولی قوت ایجاد و اختراع کا مالک ہے۔ وہ لفظوں کے جمالیاتی طلسم کو تخلیقی تخیل کا آئینہ خانہ بنا دیتا ہے۔ اس کی تازہ اور نادر ترکیب سازی اور پیکر تراشی لفظوں کے طلسماتی قصر کے ساتوں دروازے وا کر دیتی ہے جس نے اس کی شاعری کو، ہرچہ از دل خیزد بردل ریزد، کا معنوی استعارہ بنا دیا ہے۔ درج بالا اشعار سے بھی اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ چند مزید اشعار امثال کو مزید روشن کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں:

اب اک ہجومِ شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے
جنھیں کوئی نہ ملا، ہم سفر ہمارے ہوئے

دکھ ہوا جب اس در پر کل فراز کو دیکھا
لاکھ عیب تھے اس میں، خو نہ تھی گدائی کی

اے تو کہ روز و شب کو مہ و آفتاب دے
برسوں کی جاگتی ہوئی آنکھوں کو خواب دے

میں وہ کہ نقش گر ترے ارض و سما کا ہوں
تو وہ کہ مجھ کو دونوں جہاں کے عذاب دے

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کر دیا
اے شہر یار تو بھی تو اپنا حساب دے

جگر فگار کرو، دل کو تار تار کرو
یہی صلے ہیں اگر آگہی کے یونہی سہی

بزم مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں، آپ سا قاتل نہ رہے

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے، ہوا کسی کی نہیں

عصری المناکیوں اور آفاقی نامرادیوں کے ریزہ ریزہ احساسات و واردات کو فراز کے اظہار کی ندرت و نزاکت اور الہامی لب و لہجے نے پیمبرانہ جلال و جمال کا مظہر بنا دیا ہے۔ ''تعلق'' کے حوالے سے فراز کی شاعری عشقیہ واردات و کیفیات کی ایک نئی دنیا کی تشکیل و تعمیر سے عبارت ہے۔ اتنے وسیع پیمانے پر باطن کے نازک احساسات کی دھڑکتی ہوئی ترجمانی فراز کی تخصیص ہے جس کی بنا پر ان کے بعض مخالفین نے ان کو ٹین ایجر کا شاعر قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ احساسِ کمتری کی زبان تھی۔ ورنہ محبت تو پاکیزگی و معصومیت کے بے ساختہ تجربات کا وہ شیش محل ہے جس کے ہر آئینے میں ایک نیا عکس روشن ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جدائی کی
آج پہلی بار اس سے میں نے بے وفائی کی

دل منافق تھا شب ہجر میں سویا کیسا
اور جب تجھ سے ملا ٹوٹ کے رویا کیسا

جلتے رہے بے صرفہ چراغوں کی طرح ہم
تو کیا، ترے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

دیکھ آکر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں یہی سزا تھی مری

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

تو کیا کوئی بھی تعلق نہیں رہا باقی
تو کیا وہ جتنے دیے تھے بجھا دیے گئے ہیں

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ رہو

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا، ترے ساتھ ایک دنیا تھی

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فراز
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فراز
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

آج تک ان سے رہ رسم چلی جاتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

گئے دنوں میں محبت مزاج اس کا تھا
مگر کچھ اور ہی انداز آج اس کا تھا

بے مہری دنیا کا گلہ ہے ترے لب پر
اب کیسے بتاؤں تجھے، میں بھی نہیں تیرا

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

یہ تمام اشعار بلا تخصیص پیش کیے گئے ہیں۔ یہ فراز کے بعض معاصرین کی طرح اس کی بھی خوبی ہے کہ اس کے اشعار کا انتخاب کارِ مشکل ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ پر انتخاب ہے۔ کچھ اشعار ''حسن'' کے تعلق سے دیکھیے:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

ودیعت ہے تری جلوہ گری کی
جو حیرت آئینہ خانوں نے پائی
تری آنکھوں کے آگے کب سے نرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ گدائی

زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو
اس کے ملبوس سے شرمندہ قبائے لالہ
اس کی خوشبو سے جلے رات کی رانی لوگو
گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن تم جیسے
یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھا دے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

درج بالا اشعار تغزل کی ایک نئی روایت ہی کی تعمیر نہیں کرتے بلکہ ایک نئی لفظیات کی ترتیب و تدوین بھی کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ احمد فراز تغزل کی ایک نئی زبان کا موجد ہے۔ اس کا شعلۂ ادراک لفظوں کے طلسمی پیرہن میں دھنک بن کر روشن ہوتا ہے جو قاری کے وجدان کو متحرک اور بصیرت کو منور کرتا ہے۔ تشنگانِ تلخیِ دوراں کے لیے فراز کی شاعری اگر چشمۂ حیواں کی حیثیت رکھتی ہے تو دل گرفتۂ غمِ جاناں کے لیے اپنی ذات میں بیت الصنم ہے۔

□□□

پتہ:
Sapna Apartment,
Naya Tola, Patna-800006

احمد علی برقی اعظمی

خوش بیاں رخصت ہوا

آج وہ احمد فراز خوش بیاں رخصت ہوا
گلشنِ اردو زباں کا پاسباں رخصت ہوا

ناگہاں ''اردو جہاں'' سے یہ ملی مجھ کو خبر
جس کے ہیں اردو میں نقشِ جاوداں، رخصت ہوا

اپنی عصری معنویت اور حسنِ خلق سے
جو کہ تھا سب کے دلوں پر حکمراں، رخصت ہوا

منعکس تھی جس کے فکروفن سے عصری آگہی
وہ ادیب زندہ دل، جادو بیاں رخصت ہوا

ہے جہانِ اردو اس غم میں برابر کا شریک
کیوں کہ اردو کا امیرِ کارواں رخصت ہوا

ہوگیا اردو ادب میں آج پیدا اک خلا
تھا جو برقی مرجعِ دانشوراں رخصت ہوا

●

صادق

لو فراز ہم سے بچھڑ گئے

احمد فراز کی رحلت کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ان کی علالت کی خبر آئی تھی۔ اسی دوران ان کی رحلت کی خبر اڑی، جس کی تردید بھی ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کسی شخص کی زندگی میں ہی اس کی موت کی خبر اڑ جائے تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے کاش احمد فراز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا۔ پتا نہیں ان کے معاملے میں یہ عوامی عقیدہ غلط کیوں ثابت ہوا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سب سے جدا ہوگئے۔ فیض احمد فیض کے بعد احمد فراز عالمی شہرت و مقبولیت کے حامل ایک اہم اور منفرد غزل گو تھے، ان کا اس عالم فانی سے کوچ کر جانا بلاشبہ اردو شعر وادب کے لیے زبردست نقصان کے مماثل ہے لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔

احمد فراز سے میری پہلی ملاقات اَسّی کی دہائی میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد کی خبر تھوڑی ہی دیر میں پورے کیمپس میں پھیل گئی تھی اس لیے آرٹس فیکلٹی کے علاوہ کیمپس کے کالجوں کے ان گنت اساتذہ اور طلبہ انھیں سننے کے لیے جوق در جوق آگئے تھے۔ یہ سب اردو والے نہیں تھے۔ فراز کو اس پروگرام کے بعد کہیں اور بھی جانا تھا اس لیے ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور سامعین لگاتار فرمائشیں کیے جارہے تھے۔ جب انھوں نے اپنی مشہور و مقبول غزل ''رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ'' سنانے کے بعد فرمائشی سلسلہ ختم کردیا تو سامعین تشنگی کے احساس کے ساتھ ہی اس بات پر مسرور و مطمئن نظر آرہے تھے کہ انھوں نے احمد فراز کو دیکھا اور سنا ہے۔

فراز سے میری یہ ملاقات برائے نام ہی تھی کیونکہ جب پروفیسر قمر رئیس نے ان سے میرا تعارف کرایا تو میں انھیں جانتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے (گو کہ انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا) بعد ازاں نوے کی دہائی میں بلراج مین را کے ساتھ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو باقاعدہ تعارف کے بعد کچھ باتیں کرنے کا موقع بھی ملا۔ دہلی میں ان کے مدّاحوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو اکثر انھیں گھیرے رہتے تھے، ویسے یہ واقعہ ہے کہ دنیا بھر میں ان کے مدّاحوں کی کمی نہ تھی۔ ان کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ ہر ملک اور ہر شہر میں جہاں جہاں اہلِ اردو اور ناگری رسم خط میں انھیں پڑھنے والے اور ان سب سے کہیں زیادہ انھیں سننے والے موجود تھے وہ سب ان کے گرویدہ تھے۔

آخری بار میری ان سے ملاقات گذشتہ سال امریکا میں ہوئی۔ آرلینڈو میں ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جارہا تھا جس میں ایک شاعر کی حیثیت سے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جس ہوٹل میں ہم لوگ ٹھہرائے گئے تھے احمد فراز بھی اسی میں تھے۔ میں اور شاہد ماہلی ایک ہی کمرے میں تھے۔ وہیں میرے ایک عزیز دوست سیّد علی باقری بھی آگئے تھے جو عالمِ دین ہیں اور ایران میں اسلامیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ شام کو جب مشاعرے میں جانے کے لیے کار میں بیٹھے تو احمد فراز بہت دیر میں آئے۔ ممکن ہے اپنے مدّاحوں میں گھرے ہوں یا شام رنگین کر رہے ہوں یا کچھ اور وجہ ہو۔ بہرحال انگلاز یورپ کی حدوں میں داخل ہوجانے کے بعد وہ تشریف لائے۔ دو خواتین ان کے ساتھ تھیں۔ بور ہوجانے کے باوجود ہم سب نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ راستے میں نہ جانے کب اور کیسے کسی مذہبی موضوع پر باقری صاحب سے ان کی بحث چھڑ گئی۔ تلخ کلامی بھی ہوئی جس نے خاصی بدمزگی پیدا کردی۔ لیکن ہال میں داخل ہوئے تو پورا ماحول بدل گیا۔ اسٹیج پر پہنچنے کے بعد فراز اپنے مخصوص رنگ میں دکھائی دیے۔ سامعین انھیں سننے کے لیے بے قرار تھے۔ جب احمد فراز اپنا کلام سنا رہے تھے یکا یک میری نظر باقری صاحب پر جا ٹھہری وہ تھوڑی دیر پہلے کی شدید تلخیوں کو فراموش کر کے احمد فراز کے کلام سے محظوظ ہو رہے تھے اور خوش ہو کر انھیں داد دے رہے تھے۔

سنتے آئے ہیں کہ برگد کے سائے تلے کسی اور درخت کا پنپنا پروان چڑھنا ممکن نہیں، لیکن سب جانتے ہیں کہ احمد فراز نے ممتاز ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کے زیر سایہ اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ اسی ملک کی مٹی ماحول اور سیاسی و سماجی حالات کے درمیان اپنے تجربات و مشاہدات سے تحریک حاصل کی اور اسی کے معاملات و مسائل کو اپنی فکر و فن کا محور و مرکز بنایا۔ انھیں فیض کا مقلد و جانشیں قرار دینے والے ناقدین کو اس نکتے پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

فیض کی شاعری رومان و انقلاب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے اور یہی عناصر احمد فراز کی شاعری کا بھی مایۂ امتیاز ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تقریباً تمام اہم شاعروں کے یہاں یہی عناصر کارفرما نظر آئیں گے۔ رومان اردو شاعری کی بے حد مضبوط اور توانا روایت ہے اور انقلاب اپنے عہد کے حقائق سے آگاہی کا مظہر۔ غم جاناں اور غم دوراں کی بات یونہی نہیں کہی جاتی۔ یہ سنگم دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ہوا ہے لیکن فیض احمد فیض اور ان کے بعد احمد فراز کی شاعری میں جس منفرد طرز و انداز میں ہوا ہے اس نے نہ صرف یہ کہ دنیا بھر میں اپنے پڑھنے سننے والوں کو متاثر کیا بلکہ ان کے دلوں میں گھر کرلیا، عشق و محبت اور امن و انسانیت کے جذبات جگائے۔ انھوں نے انسان کے بنیادی حقوق کی بازیابی کے لیے جرأت مندی کے ساتھ آواز بلند کی اور اس کی پاداش میں حکومتِ وقت کے عتاب کے شکار ہوئے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جلاوطنی کے دکھ بھی اٹھائے لیکن اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو بہرصورت جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے اردو شاعری کی توسیع کی امکان بھر کوشش کی اور اردو شاعری کے حلقۂ اثر کو بڑھایا۔ ہندو پاک کے تہذیبی رشتوں کو مضبوط کیا۔ ایک ایسا عہد جس میں دنیا کی تمام زبانوں میں غنائیہ شاعری سے گریز کا رجحان بڑھ رہا ہے احمد فراز کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عالم گیر سطح پر غنائیہ شاعری کی ترویج و ترقی کی راہیں ہموار کیں اور اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہمیں ایسی کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی جو ان کی جگہ پُر کر سکے۔ □□□

پتہ:
A-G-1/47 C, Vikas Puri, New Delhi-110018

چندر بھان خیال

جسم مرجانے سے انسان نہیں مرجاتے

احمد فراز اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہے۔ انھوں نے ایک ایسی دنیا میں ابدی پناہ لے لی ہے جس کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات وہاں پہنچ کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کا انتقال بلاشبہ برصغیر ہندو پاک کے لیے ایک عظیم صدمہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ادبی اور ثقافتی سطح پر قائم ایک مضبوط پل اب ٹوٹ گیا ہے۔

احمد فراز صاحب عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن ہماری ملاقاتوں کے دوران عمر کا یہ فاصلہ کبھی حائل نہ ہوا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میری ان سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ لیکن چند ملاقاتیں ایسی ہیں جو میرے ذہن و دل پر نقش ہیں اور جن کی یاد ہر دم تازہ رہتی ہے۔ چند برس قبل پاکستان کے سربراہ جنرل پرویز مشرف ہندوستان آئے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے پرانی دلی میں واقع اپنا آبائی مکان بھی دیکھا تھا۔ فصیل بند شہر میں ان کی آمد کو یادگار بنانے کے لیے علاقے کے اسمبلی ممبر مسٹر شعیب اقبال نے ایک ہندو پاک مشاعرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشاعرے کا کنوینر مجھے بنایا گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ احمد فراز دلی میں ہی تشریف رکھتے ہیں۔ وہ کناٹ پلیس میں واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں فوراً وہاں پہنچا اور انھیں اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ اگرچہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کے سخت مخالف تھے لیکن دو پڑوسی ملکوں کے درمیان دوستی کے لیے جاری سرگرمیوں کے پیش نظر انھوں نے یہ دعوت قبول کرلی۔ میں نے دبی زبان میں مشاعرے کے محدود بجٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے ''خیال! میں اعزازیہ بالکل نہیں لوں گا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رشتے مستحکم ہوں یہی میرے لیے سب سے بڑا اعزازیہ ہے۔ مشاعرہ گاہ تک میں خود آجاؤں گا۔ آپ کسی طرح کی زحمت نہ اٹھائیں۔'' یہ تاریخی مشاعرہ سابق وزیراعظم ہند جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی صدارت میں ہوا تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ ایک دوسرے واقعے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دوحہ (قطر) میں ایک مقامی سرکردہ تنظیم کا سالانہ جلسہ تھا۔ ایک شاندار ہوٹل کے وسیع کانفرنس ہال میں افتتاحی تقریب جاری تھی۔ تمام مہمان مختلف ٹیبلوں کے اطراف کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں اور ندا فاضلی ایک ہی ٹیبل پر تھے۔ ٹھیک سامنے کی ٹیبل پر احمد فراز اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ میری طرف تھا۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خوبصورت اور فکرانگیز تقریر کا جادو سبھی کے سر پر سوار تھا۔ لوگ تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ تبھی اچانک تین چار ٹیبلوں کو چھوڑ کر ایک ٹیبل سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پاکستان کے ہی ایک ممتاز ادیب مشتعل ہوکر احمد فراز سے مخاطب ہیں۔ غصے میں کچھ ایسے الفاظ بھی ان کے منہ سے نکل رہے تھے جو عام طور پر ادب کی محفلوں میں کہے یا سنے نہیں جاتے۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن میں دیکھتا رہا کہ تمام وقت احمد فراز زیرلب مسکراتے رہے۔ یہ کسی ہوٹل کا بار روم نہیں تھا۔ ادب کی ایک ایسی محفل تھی جس میں تمام دنیا سے آئے ہوئے ممتاز و مشہور ادبا و شعرا شریک تھے۔ ایسی محفل میں ایک ممتاز ادیب احمد فراز پر برستے رہے اور نازیبا الفاظ بار بار دہراتے رہے، چلاتے رہے، یہاں تک کہ انھوں نے احمد فراز کو ایک گھٹیا شاعر قرار دے دیا۔ لیکن احمد فراز (ایک پٹھان شاعر) خاموش رہ کر سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے اور محفل میں کوئی بدمزگی پیدا نہ ہونے دی۔ آخر تک احمد فراز پرسکون دکھائی دیے۔ ان دونوں واقعات کے ذکر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ احمد فراز نہ صرف اعلا انسانی اقدار کے حامل اور خلوص ومحبت کے جذبے سے ہمہ وقت سرشار رہنے والے تھے بلکہ صبر وتحمل کی وہ قوت بھی ان کے پاس تھی جو انسان کو عظیم بناتی ہے۔

بلاشبہ احمد فراز امن وانسانیت کے دیوانے تھے۔ حسن وعشق کے دیوانے تھے۔ دوستی اور اخوت کے دیوانے تھے۔ خلوص اور اخلاقیات کے دیوانے تھے۔ جمہوریت، مساوات اور انصاف کے دیوانے تھے۔ یاری، انکساری اور خودداری کے دیوانے تھے۔ علم وادب اور شاعری کے دیوانے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمام عالم انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے کام کے دیوانے تھے۔ احمد فراز کی اس دیوانگی نے نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ تمام دنیا کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہندوستان سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے لوگ بھی انھیں جی جان سے چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بیشتر وقت ہندوستان ہی میں گزرتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے انھوں نے جو رول ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

احمد فراز کتنے بڑے شاعر تھے، کتنے بڑے ادیب تھے؟ ان کے شعری و ادبی مقام کا تعین تو آنے والا زمانہ کرے گا لیکن بحیثیت انسان ان کی عظمت کا اعتراف سبھی کو ہے۔ وہ ایک اعلا درجے کے انسان تھے جس کے دل میں مظلوموں اور دبے کچلے پسماندہ لوگوں کے لیے تڑپ تھی، درد تھا، دنیا جانتی ہے، جسم جانے سے انسان نہیں مرجاتے۔ وہ زندہ ہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ ان کے تمام چاہنے والوں، پرستاروں، اور ان کے اہل خاندان کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

□□□

Vice Chairman
National Council of Promotion of Urdu Language,
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi

سید امتیاز الدین

احمد فراز کی یاد میں

بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جو واقع ہونے سے پہلے اپنی آمد کی خبر دے دیتے ہیں کہ دل انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ بھی ہو تو کم از کم برداشت کرنے کے لیے کسی حد تک تیار ہو جائے۔ اسی سال جولائی کے پہلے ہفتے میں خبر اڑی تھی کہ احمد فراز کا امریکہ میں انتقال ہو گیا لیکن دوسرے ہی دن شکاگو کے ہسپتال سے جہاں وہ زیرِ علاج تھے یہ اطلاع آ گئی کہ وہ بقید حیات ہیں لیکن حالت تشویش ناک ہے۔ احمد فراز کے چاہنے والوں کو یک گونہ سکون تو ہوا لیکن اپنے محبوب شاعر کی صحت کے بارے میں مایوس کن اطلاع پا کر ایک کھٹکا سا لگا رہا جو بالآخر 25 اگست 2008 کو سانحہ بن کر رونما ہوا۔

احمد فراز غیر منقسم ہندوستان کے اس حصے سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے اب تک اردو کا کوئی اہم شاعر پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کی ولادت 14 جنوری 1931 کو نوشہرہ (پشاور) میں ہوئی اور ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بھی پشاور میں ہوئی۔

احمد فراز کے والد اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ فراز کی مادری زبان پشتو تھی۔ احمد فراز نے اردو اور فارسی کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر حاصل کی۔ فراز کی تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے تھے۔ کوہاٹ اور پشاور میں اردو شاعری کے لیے بھی سازگار ماحول تھا۔ کچھ تو اس ماحول کی دین تھی اور کچھ فراز کی فطری صلاحیتوں کا کرشمہ تھا کہ فراز کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان کے لہجے کی حلاوت اپنی مثال آپ تھی۔ ان کی زبان کا معیار بلند، مصرعوں کی بندش چست اور طرز بیان نہایت دل کش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے صنفِ غزل کا حسن شاعر کی سلیقہ مندی سے کچھ اور چمک اٹھا ہے۔

احمد فراز پیدائشی شاعر تھے۔ بچپن میں ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کے والد ان کے لیے کپڑے لائے تو وہ کپڑے ننھے فراز کو اچھے نہیں لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ جو کپڑے اس کے بڑے بھائی کے لیے لائے گئے ہیں وہ اس کے کپڑوں سے بہتر ہیں فراز نے فی البدیہہ ایک شعر کہا جس میں وزن نہ سہی ردیف قافیے کا اہتمام موجود تھا:

لائے ہیں سب کے کپڑے سیل سے
لائے ہیں ہمارے لیے کمبل جیل سے

احمد فراز کا تعلق ایک معزز سید خاندان سے تھا۔ ان کے جدِ امجد حاجی بہادر نامی ایک صوفی بزرگ تھے۔

اسکول کے دنوں میں احمد فراز ریاضی میں کمزور تھے۔ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں انھیں اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے ریاضی سیکھنے کے لیے کہا گیا۔ فراز نے ریاضی سیکھنے کی بجائے اس لڑکی کے ساتھ بیت بازی شروع کر دی۔

احمد فراز نے ایڈورڈس کالج پشاور سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے۔ کیا۔ اپنی عملی زندگی کی ابتدا انھوں نے پشاور ریڈیو میں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کی بعد میں وہ پشاور یونیورسٹی میں تدریسی عہدے پر بھی مامور رہے۔

احمد فراز کو بجا طور پر فیض احمد فیض کا جانشین قرار دیا جاسکتا ہے۔ دونوں کی شاعری میں قدیم و جدید طرزِ سخن کا امتزاج ہے۔ دونوں کو ان کے ملک کے اربابِ اقتدار ہمیشہ شبہے کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ دونوں نے اپنے طور پر جلاوطنی اختیار کی اور ملکوں ملکوں خاک چھانتے پھرے۔ دونوں کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ فیض اور فراز دونوں ہی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دونوں کے کلام میں کچھ ایسی غنائیت تھی کہ ان کے کلام کو برِصغیر کے تمام بڑے بڑے گلوکاروں نے سروں سے سجایا۔ احمد فراز کے کلام میں فیض کا رنگ جھلکتا تھا۔ بعض حاسد لوگ اس بات کو لے کر انھیں تنقید و تمسخر کا نشانہ بھی بناتے تھے۔ ایک مرتبہ فیض کسی محفل میں کلام سنا رہے تھے۔ کسی صاحب نے طنزیہ انداز میں فرمائش کی ''فیض صاحب! فراز کے رنگ میں کچھ سنائیے'' فیض مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ احمد فراز یقیناً فیض سے متاثر تھے لیکن وہ فیض کی نقل نہیں کرتے تھے۔ جس طرح دو خوش رنگ پھولوں میں مشابہت ہو تو ان کی جاذبیت اور دل کشی میں فرق نہیں آتا اسی طرح احمد فراز کی شاعری اپنے فطری حسن کی وجہ سے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی اور دلوں میں گھر کرتی رہے گی۔

احمد فراز کے لیے یہ دو شعر دیکھیے:

وہی ہم کہ جن کو عزیز تھی ذرا آبرو کی چمک دمک
یہی ہم کہ روزِ سیاہ میں زر داغِ دل بھی لٹا دیا
کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا

احمد فراز کے ذوالفقار علی بھٹو سے اچھے مراسم تھے۔ 1976 میں فراز کو ڈائرکٹر جنرل پاکستان اکادمی آف لیٹرس بنایا گیا۔ بعد میں وہ صدر نشین نیشنل بک فاؤنڈیشن کے عہدے پر فائز ہوئے

ضیاء الحق کا دور احمد فراز کو راس نہیں آیا۔ ایک مشاعرے میں فوجی حکومت کے خلاف نظم پڑھنے پر انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ''محاصرہ'' ان کی مشہور نظم ہے جو مطلق العنانی کے خلاف ان کی صدائے احتجاج ہے۔ رہا ہونے پر احمد فراز وطن چھوڑ گئے اور تین برس تک لندن، امریکہ اور یورپ کے شہروں میں جلاوطنی کے دن گزارے۔

اپنی خود اختیار کردہ جلاوطنی کے دنوں میں بھی ان کو یادِ وطن ستاتی رہی چنانچہ وہ کہتے ہیں:

یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فراز
ہم کو بے مہریِ اربابِ وطن یاد نہیں

احمد فراز کے چند اور شعر دیکھیے جو ان کے باغیانہ مزاج کی گواہی دیتے ہیں:

خلعت کے لیے حرف کا سودا نہیں کرتے
کچھ لوگ ابھی وضع ہماری نہیں بھولے
دانے کی ہوس لا نہ سکی دام میں مجھ کو
یہ میری خطا میرے شکاری نہیں بھولے
ہم مرحبا کہتے ترے ہر تیرِ ستم پر
سچ بات کہ دل اتنا کشادہ بھی نہیں تھا
جو لکھ نہیں سکتا صفِ مژگاں پہ رقم ہے
''گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے''

2004 میں فراز کو پاکستان کا قومی اعزاز ہلالِ امتیاز دیا گیا تھا انھوں نے حکومت کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 2006 میں لوٹا دیا۔ اربابِ حکومت نے ان کو گھر سے بے دخل کر دیا۔ اس پر دانشوروں کی طرف سے بہت لے دے ہوئی۔

احمد فراز کی شاعری پر ان کے بعض ناقدوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ان کی شاعری ناپختہ اور کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو متاثر کرتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ ٹین ایجر (Teenager) لوگوں کے پڑھنے کی چیز ہے۔ اس اعتراض کا جواب احمد ندیم قاسمی نے بہت اچھے طریقے سے دیا ہے۔ ایک مرتبہ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، مجید امجد وغیرہ مکۂ مکرمہ گئے ہوئے تھے انھوں نے عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ جب طوافِ کعبہ کے بعد یہ لوگ سعی کے لیے جا رہے تھے تو ایک لڑکی تیزی سے آئی اور احمد فراز کو مخاطب کر کے کہا'' آپ احمد فراز ہیں؟'' احمد فراز نے اثبات میں جواب دیا تو وہ لڑکی اپنے والد کو بلا کر لائی جن کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ ان صاحب نے احمد فراز سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ اسی برس کا آدمی ٹین ایجر (Teenager) نہیں ہوتا۔ فراز کی شاعری پر ناپختگی کا الزام غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ احمد فراز کی شاعری جذبے کی تڑپ اور احساس کی شدت کی شاعری ہے جو تجربے کی آنچ میں تپ کر نکلی ہے۔ فراز کے کلام کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ شاعر نے وہی کہا ہے جو اس پر گزر رہی ہے۔ ان کے چند اور اشعار دیکھیے:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
تیرے افسانے سنانے آئے
لوگ بھی دل ہی دکھانے آئے
فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو
ہر آشنا میں کہاں بوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ
وہ کس طرح ملا تھا جدا کیسے ہو گیا
سوچا تھا یہ سوال نہ سوچا کریں گے ہم
آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

احمد فراز ہندوستان اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات کے فروغ کے بہت آرزومند تھے۔ حالیہ برسوں میں وہ کئی بار ہندوستان آئے تھے۔ 2004 میں احمد فراز حیدرآباد بھی آئے تھے اور یہاں کے ایک مشاعرے میں اپنی وہ مشہور اور طویل غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے۔

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

اکثر بڑے فنکاروں میں ناآسودگی کی کیفیت ہوتی ہے جس کے سبب وہ دل ہی دل میں موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ یہی بات ہم کو احمد فراز کے کلام میں ملتی ہے۔

اب لہو رونے کی خواہش نہ لہو ہونے کی
دلِ زندہ ترے مرجانے کا موسم آیا
کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

اس مختصر سے خراجِ عقیدت کو میں احمد فراز کی ایک مختصری نظم پر ختم کرتا ہوں جس کا عنوان ہے'' جاؤ''

جاؤ کہ مجھے یقیں نہیں ہے
تم اب کے گئے تو آسکو گے
دہلیز سے اک قدم اتر کر
وہ راہ گزار منتظر ہے
جس پر جو کوئی چلا گیا ہے
قدموں کے نشاں بجھا گیا ہے
زخموں کے دیے جلا گیا ہے

□□□

پتہ:
3-5-805, Haidergoda, Hyderabad-500029

تاثرات

سچا فن کار

موجودہ دور میں فیض احمد فیض کے بعد احمد فراز کی شاعرانہ شہرت اور مقبولیت بے مثال تھی۔ اس شہرت اور مقبولیت میں کچھ حصہ ان غزل سراؤں کا بھی تھا جنھوں نے ان کی غزلیں اپنی دلکش آواز میں ساز اور سنگیت کے ساتھ پیش کیں لیکن اصل وجہ ان کے کلام کی خوبی ہی تھی۔ انھوں نے نہ صرف اردو کی مستحکم شعری روایت کے تمام زندہ عناصر کو اپنے فن میں جذب کرلیا تھا بلکہ عصری صورت حال پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ملکی اور عالمی سطح پر امن، آزادی اور انسانی مساوات کے اصولوں کی، جابر قوتوں کی طرف سے پامالی کو دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا۔ ان کی شاعری میں اس جبر کے خلاف جو زبردست احتجاج ہے وہ ان کے ایک سچا فن کار ہونے کی دلیل ہے۔ انھوں نے حسن وعشق کی نازک کیفیتوں کو اگر ریشمی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے تو زندگی کی کھردری حقیقتوں کو ایک انقلابی گھن گرج کے ساتھ چنوتی بھی دی ہے۔ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ ان کی شاعری ہمیشہ ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی۔

مشیر الحسن

جرأت اور دردمندی

احمد فراز چلے گئے مگر ان کے اشعار مدتوں پورے برعظیم ہندو پاک کو جگمگاتے رہیں گے۔ ان میں ایک عجیب دردمندی ہے جس میں سربلندی بھی ہے اور خواب دیکھنے کا حوصلہ بھی اور یہ حوصلہ ہر قسم کی مزاحمت سے ماسور ہے۔ انھوں نے تقریباً ایک جلاوطن کی زندگی گزاری، اپنے ملک اور معاشرے سے اکثر وبیشتر دور رہے اور معتوب رہے یعنی وہی صورت تھی کہ جس سے یا جن سے سب سے زیادہ پیار کیا ان سے جواب میں دوری ہی پائی۔

احمد فراز کی دو محبتیں ان کی شاعری کی آب وتاب بن گئیں، پہلی محبت کسی خاتون سے تھی جو رشتہ توڑ کر چلی گئیں مگر اپنی قربت کی یادیں اور تڑپ دائمی طور پر چھوڑ گئیں جس کا زخم فراز کی شاعری میں نمایاں ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ حسن کے لیے تڑپ شاید اس کی طلب سے زیادہ دل کش اور خوبصورت ہوتی ہے کہ ان سہاروں کے بل پر زندگی کو نئے معنی مل جاتے ہیں، یہی نہیں بلکہ زندگی کی مختلف جہتیں دھیرے دھیرے کھلنے لگتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود عشق وعاشقی کا یہ رخ زندگی کے دوسرے رموز و اسرار سے بھی پردہ اٹھا دیتا ہے اور اسی راستے سے ہوتے ہوئے احمد فراز ملک اور معاشرے تک پہنچے ہیں۔ بدقسمتی سے دور بھی ایسا ملا جب ان کا ملک ایک زبردست سیاسی خلفشار کا شکار تھا اور جبر واستبداد نے قلم کے بجائے تلوار سنبھال لی تھی اور راستہ سوائے قاتل کے آگے سجدہ ریز ہونے کے اور کچھ نہ تھا مگر احمد فراز نے جرأت اور جواں مردی سے حق پرستی اور حق گوئی کی قیمت ادا کرنے کا عہد کیا اور اس کے لیے تقریباً عمر بھر کی جلاوطنی کو گلے لگا لیا۔ ان کی شاعری محض تقلیدی نہ تھی بلکہ اس کی پشت پناہی انھوں نے پوری تاریخی صداقتوں اور اپنے معاشرے کی صالح قدروں سے کی تھی جس کی صرف ایک مثال وہ نظم ہے جو انھوں نے رسول مقبول پر نعت کے طور پر لکھی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے رسول کی محض روحانی برکتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس اخلاقی جرأت اور بے خوف مقابلۂ باطل کا ذکر کیا ہے جس سے احمد فراز نے خود اپنے لیے ایک تاریک دور میں ہمت اور حوصلے کے چراغ روشن کیے ہیں۔

یہ تو محض دو مثالیں ہیں جو احمد فراز کی جرأت فکر کا ثبوت ہیں لیکن ان کا اصل کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کی شعریت اور خیال کی قوت دونوں کے درمیان ایسا نادر مفاہمہ کیا ہے جس کی مثال ان کے دور میں فیض کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ لکھنا جس قدر آسان ہے اس پر عمل کرنا اتنا ہی دشوار ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے ملک میں جہاں قدریں اتھل پتھل ہو رہی ہوں اور قوت اور توانائی کے ہاتھ کا کھلونا بنی ہوئی ہوں۔

احمد فراز کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ اہل اقتدار کے ہاتھ کا کھلونا بنے نہ محض انداز بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کا شکار ہوئے، انھوں نے شاعری کو درد زیست کی طرح اپنایا اور پوری جرأت اور دردمندی کے ساتھ اپنایا۔ انھوں نے شاعری کو صرف ظاہری بناوٹ سے آزاد کرکے اسے اپنے دل کی بلکہ اپنی زندگی کی بھرپور عکاسی بنا دیا۔ گو اس کے لیے انھیں بڑی قربانیاں دینی پڑیں کہ بقول شاعر: گراں سودا بجاں بودے چہ بودے

اب جبکہ احمد فراز بہت دور جا چکے ہیں ان کا کلام ہم سے اتنا ہی قریب ہوگیا ہے۔ اس میں مفاہمت اور دکھ درد کے آگے سر ڈالنے کی کم ظرفی کے بجائے قربانی اور ایثار کے وہ جوہر پوشیدہ ہیں جو اعلیٰ اقدار کے امین ہیں اور جو شاعری میں جان اور ایمان کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور انھی کیفیات کے لیے احمد فراز یاد رکھے جائیں گے اور ان کا کلام مقدس امانت سمجھا جائے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد حسن

ایک بے باک، حق گو اور محبت بھری آواز

احمد فراز کی ناوقت موت نے اردو شاعری کے ایک گوہر آب دار کو ہم سے چھین لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بے باک، حق گو اور محبت بھری آواز

ہم سے دور چلی گئی اپنی حق گوئی اور بے باکی کے سبب وہ مدتوں، ایک جلاوطن کی زندگی گزارتے رہے مگر بے باکی اور سچ کا دامن انھوں نے نہ چھوڑا۔ ہندوستان اور پاکستان میں صلح و آشتی اور میل محبت کے قیام کی کوشش ان کی زندگی کا نصب العین ہمیشہ رہا۔ پاکستان میں فیض صاحب کے بعد، اب ایسا دیدہ ور، نغز گو اور شاعری کی روشن مشعل کو لے کر آگے چلنے والا کوئی نہیں رہا۔ میں اسے اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہوں۔ **سید محمد عقیل**

وہ انسان دوست تھے

احمد فراز کی وفات سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا تھا۔ اگر 20ویں صدی میں فیض احمد فیض کے بعد اردو میں کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا ہے جس نے پاکستان میں آمریت کے خلاف بغاوت کی تھی اور جسے ہم صحیح معنوں میں ایک روشن خیال شاعر کہہ سکتے ہیں تو وہ فراز ہی تھے۔ احمد فراز کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انسان دوست تھے اور انھوں نے کبھی ملک و قوم، مذہب اور علاقائیت کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم نہیں کیا۔ جن دنوں میں وہ پاکستان میں آمریت کے خلاف بغاوت کی سزا میں جلاوطن تھے تو وہ لندن میں تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں بھی ان دنوں لندن میں تھا۔ ان دنوں افتخار عارف صاحب کا اردو مرکز قائم تھا اور وہاں اکثر ہندوستان اور پاکستان کے شاعر جمع ہوتے تھے، وہیں میں اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور احمد فراز گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ میں نے ان سے بچپن کے کچھ حالات دریافت کیے تو وہ ٹال گئے اور میرے بہت اصرار کے بعد انھوں نے اپنے بارے میں صرف یہ بتایا کہ انھیں بچپن سے ہی شعروشاعری کا ذوق تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ دس بارہ سال کی عمر ہی سے شعر کہہ رہے تھے۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ انھوں نے کہاں تک تعلیم پائی تھی لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ دنیا کے جن ملکوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں کے مشاعروں میں احمد فراز کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ انھیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ میں نے ایک دفعہ ان کے کلام میں سہل ممتنع، زبان کی روانی، سلاست اور شیرینی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ مرزا داغ کے شاگرد رہے ہیں۔ انھوں نے قہقہہ لگا کر کہا کہ ہاں نوجوانی میں ان کا کلام پڑھا تھا اور میں ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری زبان میں داغ کی سی روانی اور سادگی ہے۔

احمد فراز کی شاعری میں عشق و محبت کی داستانیں بھی ہیں اور ہمارے عہد کے سماجی مسائل کا گہرا شعور بھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ ممبر تھے یا نہیں لیکن ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ترقی پسند شاعروں کے کلام میں ہوتی ہیں۔ احمد فراز ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں غیر معمولی طور پر مقبول تھے اور ان ملکوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے جن ممالک میں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے ان میں احمد فراز کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوستان میں ان کے کلام کے اردو مجموعے بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے مجموعۂ کلام اردو سے زیادہ دیوناگری میں شائع ہوئے ہیں۔

فیض کے بعد احمد فراز پہلے پاکستانی شاعر ہیں جن کی وفات کی خبر ہندوستان کے تمام ٹی وی چینلوں پر نشر کی گئی اور ان کے حالات خاصے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے۔ **خلیق انجم**

زبان اور اوزان کی موسیقیت

احمد فراز عصر حاضر کے ان اہم شاعروں میں ہیں جنھوں نے غزل کی روایت کا احترام کرتے ہوئے اُسے ایک نیا مزاج دیا جو آج کے انسان خصوصاً نوجوانوں کے جذبہ و احساس سے ہم آہنگ ہے۔ اُن کی شاعری میں، وہ نظم ہو یا غزل جو لہجہ اور آہنگ ہے وہ ہماری صدیوں پرانی روایت کے ساتھ ساتھ اپنے منفرد اور تازہ تر رنگ کی بدولت اتنا مقبول ہوا کہ دنیا میں جہاں کہیں اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ موجود ہیں وہاں احمد فراز کا نام آج کی شعری روایت کی ایک علامت بن گیا۔ ان کی شاعری میں زبان اور اوزان کی موسیقیت اپنا الگ جادو جگاتی ہے جس کی بنا پر وہ برعظیم کے بڑے موسیقاروں میں اس قدر مقبول ہوئے کہ آج کی غزل گائیکی کا تصور احمد فراز کی غزل کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل فیض اور اخترالایمان کے بعد اردو شاعری کی جو فضا بنی اور نہ صرف برعظیم میں بلکہ تمام اردو دنیا پر چھا گئی، اس میں احمد فراز کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔

وہ ہندوستان اکثر آیا کرتے تھے اور جب بھی کسی محفل یا بزم سخن میں ہوتے، ان کے نام کی بدولت اہل ذوق بڑی تعداد میں جمع ہوتے، دیر تک ان سے تازہ کلام کی فرمائشیں ہوتی رہتیں، اُن کا کلام اردو والوں ہی میں نہیں بلکہ خوش ذوق لوگوں کے تمام حلقوں میں پسند کیا جاتا تھا، چنانچہ ہندی میں بھی اُن کے کلام کے کئی ایڈیشن چھپے اور ہندی کے رسالوں میں بھی وقتاً فوقتاً اُن کا کلام شائع ہوتا رہا۔

انھیں اپنی سماجی، سیاسی ذمے داری کا بھی پورا احساس تھا۔ چنانچہ اُن کی روشن خیالی اُن کے کلام، ان کے بیانات اور ان کی زندگی میں بھی نمایاں رہی جس کی وجہ سے انھیں قید جلاوطنی اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان کی جلاوطنی کے زمانے میں میں نے دیکھا تھا کہ انھیں کن اذیتوں کا سامنا تھا، مگر انھوں نے کبھی بھی ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھانے سے گریز نہیں کیا۔ وہ ہند و پاکستان کے درمیان مفاہمت اور دوستی کے حق میں تھے اور اس کا اظہار انھوں نے ہر موقع پر کیا۔

ان کے جیسے شاعر اور دانشور کا وجود اس دنیا میں بہت ضروری ہے، جہاں آج انسانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے والے ہر خطۂ زمین پر سرگرم ہیں۔ ان کے انتقال سے شعروادب اور سماجی زندگی میں ایک بڑا خلا ہو گیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ ان کی آواز برِعظیم کی فضا میں مدتوں گونجتی رہے گی اور اس کا خوش گوار اثر ہمیشہ جاری رہے گا۔ صدیق الرحمٰن قدوائی

احتجاجی جذبات اور مزاحمتی احساس

برصغیر کے ہر دل عزیز اور نامور شاعر اور دانشور احمد فراز کی موت کے سانحے نے اردو دنیا میں سوگ کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ ہندو پاک کے گلوکاروں نے احمد فراز کا مترنم کلام کچھ ایسے والہانہ شوق سے گایا کہ ان کی مقبولیت نہ صرف اہلِ ذوق بلکہ عام لوگوں میں بھی پھیلتی رہی اور انھیں محبوب تر بناتی رہی۔ وہ نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ غیر معمولی ذہانت سے مالا مال ایک ایسے دانشور بھی تھے جو اپنے ملک کے اور ساری دنیا کے انسانی مسائل پر گہرائی سے غور وفکر کرتے تھے۔ وہ اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر ایک انوکھا انقلابی رویہ بھی رکھتے تھے۔ وہ ظلم و جبر کی عالمی طاقتوں اور خود اپنے ملک میں آمریت کے جبر واستبداد کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے قید تنہائی کے اذیت ناک دن گزارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت کے مشکل اور صبر آزما دن بھی بسر کیے۔ ان کی بہت سی نظموں میں ان تلخ تجربات کا احساس پوری شدت سے کارفرما ہے۔ مثال کے طور پر دوسری ہجرت، بیروت، منشور، شہر کے سورج یہ ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کا لب ولہجہ مزاحمتی اور احتجاجی روپ میں نظر آتا ہے، اسی طرح اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں، محاصرہ، شہر آشوب، جیسی نظمیں بھی احتجاجی جذبات اور مزاحمتی احساس سے معمور ہیں۔ وہ فلسطین ہو، لبنان ہو، افریقہ ہو، جہاں جہاں مجاہدینِ آزادی پر ظلم واستبداد ہوتا تھا احمد فراز کے لب و لہجے میں احتجاج کی لے تیز ہو جاتی تھی۔ 1982 میں جب بیروت پر اسرائیلی حملے میں سینکڑوں فلسطینی مجاہدین شہید کر دیے گئے، اس کی گونج احمد فراز کی کئی نظموں میں ملتی ہے۔ مثلاً ایک نظم کا یہ بند دیکھیے:

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ادا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے

محل سراؤں میں خوش عقیدہ شیوخ چپ ہیں
حرم کے سب پاسبان اور بادشاہ چپ ہیں
تمام عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے لاالہٰ، چپ ہیں

اس طرح کی بے شمار نظمیں ہیں۔ احمد فراز امن اور آشتی کے پیامی تھے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی امن، دوستی اور فلاح کے جذبات کی آبیاری کرتے تھے۔ وہ ایک نہایت باہمت اور مجاہدانہ عزم رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تخلیق کار محض کاغذ پر اپنے جذبات اتار کر مطمئن نہیں ہو سکتا اسے انسانیت اور بنی نوع انسان کی فلاح اور آزادی کے لیے بھی جدوجہد کے میدان میں اترنا ضروری ہے۔

ان کی تمام شاعری، زمین پر انسان کی تذلیل اور غلامی کے خلاف ہمہ گیر احتجاجی جذبات سے معمور ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فیض احمد فیض کے بعد وہ پاکستان و ہندوستان میں سب سے زیادہ ہردلعزیز اور مقبول شاعر تھے۔ وہ ایک سچے انقلابی تھے اور انقلاب کا تصور ان کے ذہن میں صرف سیاسی تبدیلی نہیں تھا بلکہ سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی ایک صحت مند نظام کا قیام تھا۔
قمر رئیس

انسانی تجربات اور احساسات و جذبات کی تجسیم

احمد فراز کی رحلت کی خبر سن کر مجھے دلی دکھ ہوا۔ اس دکھ کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ان سے میں پہلی بار ماریشس میں ملا جہاں وہ اور میں ایک سیمینار کے سلسلے میں مدعو تھے۔ یہ 1988 کی بات ہے بیس برس کے درمیانی عرصے میں مجھے ان سے ملنے کے کئی موقعے ملے جن میں ماریشس والی ملاقات کی مختلف زاویوں سے تجدید ہوتی رہی۔ ان کے ملنے کا انداز انتہائی بے ساختہ، بے تکلف اور تمازت انگیز تھا۔ ادب، سیاست، ذاتی تجربات اور حصول اعزاز و مرتبہ کا ذکر کرتے وقت وہ کچھ ایسی دلکشی اپنی گفتگو میں شامل کر دیتے تھے کہ سننے والا ان کے اندازِ گفتگو کا جادو دل و جاں کی گہرائی تک محسوس کرتا تھا۔ احمد فراز کا شمار ہندو پاک کے عالی مقام اور مقبول ترین شاعروں میں ہوتا تھا۔ وہ اگرچہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن حاوی انداز میں غزل کے شاعر تھے، اور غزل کے بھی ایسے شاعر کہ سینۂ قرطاس پر رقم لفظ سے لے کر متکلم پیش کش تک تمام تر مدارج میں دادوتحسین سے سرفراز ہوتے تھے۔ ان کے حلقۂ قارئین وسامعین میں خاص و عام دونوں شامل تھے۔ وہ ادبی جرائد کے صفحات ہوں یا مشاعرے وہ ہر مقام پر یکساں طور پر کامیاب تھے۔ احمد فراز کی غزل انسانی تجربات اور احساسات و جذبات کی تجسیم کچھ اس انداز سے کرتی ہے کہ بے اختیار ترسیل کا معجزہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور قاری اور سامع اس ترسیل کے معجزے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ رومانی کیفیات کی دلآویزی اور دلدوزی کا اظہار کرنے کا انداز کوئی ان

سے سیکھے۔ ان کی وفات سے پوری اردو دنیا سوگوار ہوگئی ہے۔ ان کی یادیں ان کے چاہنے والوں کے دلوں میں جن میں بہرحال میں بھی شامل ہوں، ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

بلراج کومل

ان کی جیسی شہرت اور مقبولیت ان کے ہم عصروں میں کسی کو نہ ملی

آخر وہ بات ہو ہی گئی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ احمد فراز کی زندگی، ان کی جان لیوا بیماری اور موت ـــ ان سب کے گرد کہانیوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ان کی جیسی شہرت اور مقبولیت، ان کے ہم عصروں میں کسی کو نہ ملی۔ یہ مقبولیت ان کے کمال فن اور ان کی تخلیقیت کا حجاب بھی بن گئی تھی۔ یہ خیال عام تھا کہ فراز کی شاعری اور ان کے شاعرانہ مرتبے کا سارا ہنگامہ ان کی احتجاجی روش، جلاوطنی کے افسانے، مشاعروں میں ان کی مقبولیت اور ان کے گلوکاروں کا مرہون منت ہے۔ بے شک، معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے ہماری دنیا بڑی حد تک کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تعلقات عامہ، جوڑ توڑ، منصوبہ بندی، ڈھٹائی اور سستی شہرت اس عہد کا عام اسلوب بن چکے ہیں۔ لیکن فراز کی جیسی شہرت اور مقبولیت کو اتنے لمبے عرصے تک سنبھالے رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ فراز اپنی روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اظہار و بیان کے اسالیب پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ عام زندگی کے تجربوں سے ان کی حسیت کا رشتہ بہت مستحکم تھا۔ ان کا فکری سرمایہ محدود تھا، مگر ان میں شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا اور جذباتی یا حسی سطح پر وہ کبھی چھلکتے نہیں تھے۔ مشرق و مغرب کی دنیا کے ہر علاقے میں ان کے مداح اور ان کی شاعری کے شائقین موجود تھے۔ فراز نے ایسے بہت سے شعر کہے ہیں جو بڑی آسانی سے زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔

فراز کے اٹھ جانے سے جو خلا ہمارے ادبی معاشرے میں پیدا ہوا ہے، وہ شاید اب پُر نہ ہو سکے گا۔ مشاعروں کی سطح روبہ زوال ہے اور شعر سے سنجیدہ شغف رکھنے والوں کا حلقہ سمٹتا جارہا ہے۔ فیض کے بعد فراز اردو معاشرے کا دوسرا لیجنڈ کہے جاسکتے ہیں۔ ایسی عام مقبولیت اب کیا کسی کے حصے میں آئے گی۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

شمیم حنفی

جمالیاتی حس اور انقلابی آہنگ

اب کے بچھڑے ہوئے شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے مرجھائے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

احمد فراز کا یہ شعر جب میں نے سنا اور مہدی حسن کی آواز نے اس کے جادو کو جگایا تو مجھے شوق ہوا کہ ان کے بارے میں جانوں۔ معلوم ہوا کہ یہ میرے ہم پیشہ ہیں یعنی ایک براڈ کاسٹر۔ احمد فراز پاکستان بننے کے بعد ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم ہوئے۔ اس اعتبار سے میں ان سے پرانا براڈ کاسٹر ہوں چونکہ میں نے 1945 میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی جوائن کیا تھا۔ ہم دونوں میں شاعر ہونے کے علاوہ ایک قدر مشترک یہ تھی کہ انھوں نے بھی سید ذوالفقار علی بخاری سے براڈ کاسٹنگ کی تربیت پائی تھی اور میں نے بھی۔ احمد فراز نے بڑی تیزی سے شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کی کتاب ''جاناں جاناں'' برصغیر کے کونے کونے میں پہنچی اور ان کے بلند بالا قد و قامت، خوبصورت ناک نقشے اور سرخ و سفید رنگ نے اور ان کی جذبات میں ڈھلی ہوئی آواز نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ جب انڈو پاک مشاعروں میں ہندوستان آنے لگے تو مجھے یاد ہے کہ 1985 میں میں نے ان کا استقبال غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں کیا تھا جب میں وہاں ڈائرکٹر تھا۔ اس ملاقات کے بعد دسیوں بار ان سے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ 1986 میں جب عراق میں المربد فیسٹیول منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے چھ سو شاعروں نے حصہ لیا تھا تو وہاں میں نے ہندوستان کی نمائندگی کی تھی اور پاکستان کی نمائندگی احمد فراز نے کی تھی، بغداد میں ہم لوگوں کی بہت بے تکلف ملاقاتیں رہیں۔

احمد فراز کے یہاں جمالیاتی حس کے ساتھ انقلابی آہنگ بھی تھا۔ چنانچہ اسی کے باعث وہ ریڈیو کی ملازمت سے معزول کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے حکومت پاکستان کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ ان کی ریڈیو ملازمت سے معزولی غیر قانونی ہے۔ وہ مقدمہ جیت گئے اور کافی روپیہ ایریئر میں ملا۔ جس زمانے میں بیکار تھے، ان کے ایک دوست نے جو بلڈر تھا انھیں اس کام میں آنے کا مشورہ دیا اور اس کے لیے کچھ روپیہ بھی دیا۔ اس طرح وہ کچھ عرصے کے لیے بلڈر بھی ہو گئے تھے۔ یہ بات انھوں نے خود مجھے ایک ملاقات میں بتائی تھی۔ آخر میں وہ پاکستان کے نیشنل بک ٹرسٹ قسم کے کسی ادارے کے سربراہ ہو گئے تھے۔ ان کا آخری دور بہت عیش و آرام سے کٹا۔ عیش پرست تو وہ مزاجاً تھے پانی کی طرح شراب پیتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے کونے کونے میں مشاعرے پڑھے اور پاکستان میں فیض احمد فیض کے بعد ان کو بحیثیت شاعر کے بڑی مقبولیت ملی۔ ان کی کثرت شراب نوشی ان کی صحت کی دشمن ثابت ہوئی۔ سنا ہے ان کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ علاج کے لیے امریکا بھی گئے مگر واپس اپنے وطن لوٹ آئے اور پاکستان کی سرزمین میں ہی انھیں آخری پناہ گاہ ملی۔ احمد فراز بیسویں صدی کے اہم اردو شاعروں میں شمار کیے جائیں گے اور ان کے یہاں انڈو پاک دوستی کا جو سچا جذبہ تھا اسے بھی یاد رکھا جائے گا۔

رفعت سروش

زندہ جذبوں کی شاعری

فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری اور ناصر کاظمی کے بعد جن شعرا نے غزل کی اعلیٰ روایات کا پاس رکھا اور اسے مقبول عام بنانے کی کوشش کی ان میں احمد فراز کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احمد فراز اس لیے بھی یاد رکھے جائیں گے کہ ان کی غزل اس کتابی غزل سے ایک الگ راہ اختیار کر کے چلتی ہے جس

کی معیار سازی ہماری موجودہ تنقید نے کی تھی اور جو جذبے سے خوف کھاتی تھی۔ اس میں دلسوزی اور جاں سوزی کی کیفیت ہے جس کے اظہار کے لیے انھوں نے نشاطیہ آہنگ کو ترجیح دی ہے۔ غالب کا آہنگ بھی نشاطیہ ہے جو اپنے غموں اپنی محرومیوں اور نارسائیوں کو ایک نیا نام دینے کی کوشش سے عبارت ہے اور نفی سے اثبات کی راہ نکالنے کی صورت بھی اس میں مضمر ہے۔

انسانی جذبوں میں عشق کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ہماری شاعری کا بڑا حصہ عشقیہ جذبوں پر استوار تھا، جس کے کئی ابعاد تھے۔ وصل ایک خفیف ترین مہلتِ زماں کا نام ہے اور ہجر ایک ایسی واردات جو عشق کے جذبے کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ احمد فراز کے یہاں ہجر کا تجربہ تمام تجربوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ تمام اشعار جو دوری اور فاصلے یا انتظار کی کیفیات کے مظہر ہیں اصلاً ہجر کی کیفیت ہی سے مشتق ہیں:

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

دور ہے تو، تو تری آج پرستش کرلیں
ہم جسے چھو نہ سکیں، اس کو خدا کہتے ہیں

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

اس قسم کے جذبوں اور تجربوں کی اپنی قیمت ہے۔ فراز نے انھی استعاروں اور اشاروں میں سیاسی تناؤ اور کشاکش کو بھی زبان دی ہے۔ اس معنی میں فراز نے غزل کو محض اظہار ذات کا وسیلہ ہی نہیں بنایا بلکہ وہ کئی اطراف کو محیط ہے۔ احمد فراز کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے جذبوں میں شریک کرلیتی ہے۔ اس کی عام مقبولیت کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے کہ وہ بہت قریب سے اپنی شناخت کراتی اور اپنے جذبوں میں شمولیت کی راہیں کھلی رکھتی ہے۔ حبیب جالب کی چیخ کو انھوں نے نرم آواز میں سمویا تھا جو زیادہ مؤثر اور زیادہ جادو کا اثر رکھتی ہے۔ احمد فراز کی کمی ہمیں مدتوں تڑپاتی رہے گی۔

عتیق اللہ

انسانی اقدار اور تہذیبی سچائیاں

فیض احمد فیض کی عوامی اور رومانی شاعری نے جس میں انسانی اقدار اور تہذیبی سچائیاں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھیں پورے برصغیر کی اجتماعی انسانی آرزوؤں کی ترجمانی کے لیے جو شعری آہنگ ایجاد کیا تھا اس کی وراثت براہ راست احمد فراز کو پہنچی تھی۔ احمد فراز نے اس وراثت میں عشقیہ اور سیاسی علامتوں کو یکجا کرکے ایسے نئے پہلوؤں کا اضافہ کیا جن میں ایک طرف دبے کچلے لوگوں کے انسانی وقار کو بحال کرنے کی خواہش نمایاں تھی تو دوسری طرف انسانی جذبوں کو ان کے مختلف رنگوں میں پوری شدت کے ساتھ محسوس کرنے کی صلاحیت موج زن تھی۔

احمد فراز کی شاعری نے بہ یک وقت نوعمری کے جذبوں اور پختہ افکار دونوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جس کی وجہ سے انھیں برصغیر کے تمام اہل اردو میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی جس کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی وہ اتنے ہی مقبول اور محترم تھے جتنے کہ اردو والوں کے لیے۔ ان کی شاعری میں عام انسانوں کی زندگی کے مسائل اور عام جذبوں کو چھونے کی غیر معمولی صلاحیت تھی اور یہی ان کی بے پناہ مقبولیت کی بنیاد بھی ہے۔

احمد فراز نے اپنی شاعری سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثقافتی رابطوں کے ایسے پل تعمیر کیے جو ان کے بعد بھی محبت اور مصالحت کے جذبوں کو فروغ دیتے رہیں گے۔ وہ کہنے کو پاکستانی شہری تھے مگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی شہریت بھی انھیں حاصل تھی۔ ان کی وفات سے اردو کے شعری ادب میں ایک کبھی نہ بھرنے والا خلا تو پیدا ہوا ہی ہے دونوں ملکوں کے درمیان امن وسلامتی کو فروغ دینے کے عمل کو بھی صدمہ پہنچا ہے۔

اختر الواسع

بنیادی آہنگ عشقیہ تھا لیکن وہ رجز کے بھی شاعر تھے

احمد فراز اردو کے مقبول ترین شاعر تھے ان کے سانحۂ ارتحال سے اردو کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ پچھلے دنوں اردو کی کئی نامور شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ اب اس برصغیر بلکہ پوری اردو دنیا کے بڑے شاعر احمد فراز کا انتقال ہوگیا۔ جن کو اردو سے ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ احمد فراز کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ وہ نہ صرف یہ کہ مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر تھے بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم تھی جدید شعرا میں احمد فراز کا نام کئی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو احمد فراز کی شاعری کا بنیادی آہنگ عشقیہ تھا لیکن وہ رجز کے بھی شاعر تھے۔ ان کی شاعری ظلم و جبر کے خلاف ایک زبردست مزاحمت کا استعارہ ہے۔ انھوں نے ظلم و جبر کے خلاف اپنے قلم سے مسلسل جہاد کیا وہ ہند و پاک کے درمیان محبت کے سفیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا انتقال اردو کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ احمد فراز چونکہ امن عالم کے پیغامبر تھے اور اپنی شاعری سے ساری زندگی امن و محبت کا پیغام دیتے رہے اس لیے ان کی خدمت میں سب سے بڑا نذرانۂ عقیدت یہ ہوگا کہ ہم اپنے طور پر امن و محبت کے پیغام کو عام کریں اور کوشش کریں کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں جو کسی خاص ملک یا مذہب کی زبان نہیں بلکہ محبت کی زبان ہے اور جس کی ترویج و اشاعت کے لیے احمد فراز جیسے شعرا نے اپنی ساری زندگی وقف کردی تھی۔

علی جاوید

احمد فراز

منتخب کلام

ابیات

[بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم]

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے
نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے
تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے
ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے
یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے
مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے
خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے
نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس
کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے
ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے
مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے
میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ با شرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

•

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
وہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے، یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب، ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنّی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

●

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازوسناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے

مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو
جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں ان کے گھر
بے کفن ان کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرالیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب ان کی ثنا چار سو ہے
قلم سرخرو ہے

غزلیں

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں
کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے، تعبیر کر کے دیکھتے ہیں
اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

●

یوں تو محرومِ نوا کب سے دہن میرا تھا
پھر بھی چرچا ہوا جس کا وہ سخن میرا تھا
میں نے کس نشۂ نخوت میں کماں کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اترا وہ بدن میرا تھا
تو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تارِ کفن میرا تھا
اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا
آخری شامِ خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا
میری آنکھوں نے جو دیکھا میرے لب پر آیا
میری تقصیر ہی بے ساختہ پن میرا تھا
تھی افق تا بہ افق یوں تو مری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

●

میں دھوکا ہوں تو دھوکا ہے
ترک و طلب ہر دُو دھوکا ہے

تیری ہر مُسکان فریبی
میرا ہر آنسو دھوکا ہے

سارے گل بوٹے مصنوعی
رنگ، نمو، خوشبو دھوکا ہے

کون ہے یکتا کون یگانہ
مدحِ رخ و گیسو دھوکا ہے

لافِ محبت ہرزہ سرائی
دلبر غالیہ مُو دھوکا ہے

چاکِ جگر اک شعبدہ بازی
اُس پر کارِ رفو دھوکا ہے

کمر ہے عشق کا دیوانہ پن
حسن کا سب جادو دھوکا ہے

نالۂ قمری وہمِ سماعت
سرو کنارِ جُو دھوکا ہے

رنگِ پرِ طاؤس نمائش
سحرِ رمِ آہو دھوکا ہے

عکس فقط نیرنگ نظر کا
ہر بُتِ آئنہ رُو دھوکا ہے

نشہ کہاں ہے زخم کا مرہم
ساقی و جام و سبو دھوکا ہے

کاوشِ لوح و قلم افسانہ
قصۂ تیغ و گلو دھوکا ہے

کس نے خون کے آنسو روئے
دامن لہو لہو دھوکا ہے

مستوں کی مستی دکھلاوا
صوفی کی یاہُو دھوکا ہے

مسجد میں بٹ مار ہے مُلّا
مندر میں بھکشو دھوکا ہے

کذب و ریا کی ڈفلی باجے
چیلا جھوٹ، گرو دھوکا ہے

جو پاگل تھے سو پاگل ہیں
حکمت کا دارُو دھوکا ہے

اُتر دکھن پورب پچھم
اس جگ میں ہر سُو دھوکا ہے

●

ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں
کہ زخم کھاتے گئے ہیں دعا دیے گئے ہیں

ہم اپنی آبلہ پائی پہ منفعل تو نہیں
جو تیز رو تھے انھیں راستہ دیے گئے ہیں

کہاں سے حوصلہ لاتے پیمبروں جیسا
سو کیا یہ کم ہے کہ شاعر بنا دیے گئے ہیں

جہانِ عشق سے کیا دل سا تاجدار گیا؟
جو شہرِ درد کے پرچم جھکا دیے گئے ہیں

تو کیا کوئی بھی تعلق نہیں رہا باقی
تو کیا وہ جتنے دیئے تھے بجھا دیے گئے ہیں

سو شہرِ علم کا کیا حال اب کہیں کہ وہاں
محبتوں کے صحیفے جلا دیے گئے ہیں

نئے زمانے میں آتے رہیں گے لوگ نئے
ہمارے نقشِ قدم بھی مٹا دیے گئے ہیں

●

منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں

کوئی قاصد ہو کہ ناصح، کوئی عاشق کہ عدو
سب کی اس شوخ سے وابستگیاں ایک سی ہیں

دشتِ مجنوں نہ سہی تیشۂ فرہاد سہی
سفرِ عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں

یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
راحتیں ایک سی، افسردگیاں ایک سی ہیں

صوفی و رند کے مسلک میں سہی لاکھ تضاد
مستیاں ایک سی، وارفتگیاں ایک سی ہیں

وصل ہو، ہجر ہو، قربت ہو کہ دوری ہو فراز
ساری کیفیتیں سب تشنگیاں ایک سی ہیں

●

کل پرسشِ احوال جو کی یار نے میرے
کس رشک سے دیکھا مجھے غم خوار نے میرے

بس ایک ترا نام چھپانے کی غرض سے
کس کس کو پکارا دلِ بیمار نے میرے

یا گرمیِ بازار تھی یا خوفِ زیاں تھا
پھر بیچ دیا مجھ کو خریدار نے میرے

ویرانی میں بڑھ کر تھے بیاباں سے تو پھر کیوں
شرمندہ کیا ہے در و دیوار نے میرے

جب شاعری پردہ ہے فراز اپنے جنوں کا
پھر کیوں مجھے رسوا کیا اشعار نے میرے

●

اعجاز احمد

آؤٹ سورسنگ اور ہندوستان

آؤٹ سورسنگ کو عام طور پر بول چال کی زبان میں بزنس پروسیس آؤٹ سورسنگ (B.P.O.) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا سسٹم ہے جس میں باہری ذرائع سے کوئی سامان بنوایا یا کوئی کام کرایا جاتا ہے۔ حقیقت میں کسی بزنس انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے اپنی شرطوں کے مطابق انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T.) پر مبنی پروسیس کا اہتمام اور انتظامیہ سے متعلق کام ٹھیکے پر باہری ذرائع سے کرانا ہی آؤٹ سورسنگ ہے۔ آؤٹ سورسنگ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور گلوبلائیزیشن (Globlisation) کے پھیلاؤ کا ایک جدید طریقہ کار ہے۔ اس میں ایک طرف جہاں کام کی کوالیٹی میں معمولی سی کمی آتی ہے وہیں اخراجات میں اچھی خاصی کمی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ سسٹم برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آج آؤٹ سورسنگ نے انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T.) کے معاملے میں خصوصی طور پر عالمی مقام حاصل کرلیا ہے۔ ترقی یافتہ ملک، جہاں دیگر ممالک کی بہ نسبت مزدوری کی اجرتیں زیادہ ہیں، ترقی پذیر ملکوں سے آئی ٹی سافٹ ویئر اور دیگر خدمات آؤٹ سورسنگ کے ذریعے حاصل کرنے لگے ہیں۔

آؤٹ سورسنگ کا طریقہ بہت ہی آسان اور سہل ہے۔ مثال کے طور پر کسی کمپنی کو اپنی مصنوعات کی تشہیر کروانی ہو تو کسی دوسرے وسیلے کے مقابلے میں کم وقت اور کم اخراجات میں کروانے کے لیے آؤٹ سورسنگ کی مدد لی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے امیر ممالک کو تو کم اخراجات میں مخصوص کام ہوجانے کی وجہ سے فائدہ ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ہندوستان جیسے زیادہ آبادی والے غریب ملک کے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں۔ آؤٹ سورسنگ سے وابستہ کارکنوں کو تنخواہ بھی اچھی ملتی ہے۔ یہ سارے کام کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیکس اور دیگر جدید قسم کے الیکٹرانک ذرائع سے کم وقت اور کم خرچ میں ہوجاتے ہیں۔ اس سے آمدورفت اور ٹرانسپورٹ وغیرہ میں ہونے والے وقت کی بربادی، ماحولیاتی پراگندگی جیسی دیگر دوسری پریشانیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

آؤٹ سورسنگ کے پس منظر پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تجارتی حلقے میں یہ طریقہ کار کافی پرانا ہے۔ حالانکہ دور حاضر میں اس کے استعمال کے طریقے میں زبردست تبدیلی ضرور آئی ہے۔ پہلے جو آؤٹ سورسنگ کا رواج تھا وہ اشیا کی تیاری کی بنیاد پر تھا جبکہ اب یہ خدمات پر منحصر ہوتا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کی ایک مشہور آٹو موبائل کمپنی جنرل موٹر پہلے بھی اپنی کار کے کچھ پرزے ہندوستان میں بنوا رہی تھی۔ اسی طرح کئی غیر ملکی ٹیلی ویژن کمپنیاں پکچر ٹیوب کے کچھ حصے ہندوستان میں بنواتی رہی ہیں اور اس طرح کے کئی کام کافی لمبے عرصے سے دنیا کے کئی حصوں میں کئی کمپنیوں کے ذریعے کرائے جاتے رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اشیا کی آؤٹ سورسنگ ہی ہے جس میں باہری ذرائع سے سامان تیار کرایا جاتا ہے۔ لیکن آج کل اس کی بجائے بڑے پیمانے پر خدمات کی آؤٹ سورسنگ ہونے لگی ہے۔ خدمات کی آؤٹ سورسنگ ایک جدید پہل ہے جو اب سے چھ سات سال قبل ہی شروع ہوئی ہے۔ یہ شروعات پہلے چھوٹے پیمانے پر طبی صلاح کے طور پر ہوئی۔ اس کی کامیابی سے متاثر ہوکر ترقی پذیر ملکوں نے اسے کئی دیگر شعبوں میں شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور آج یہ بڑی تیزی سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں اپنے قدم بڑھاتی جارہی ہے۔

اب بات کریں اپنے ملک ہندوستان کی جو کہ آؤٹ سورسنگ میں عالمی سطح پر نمبر ون کی حیثیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اس سے ہندوستان کو کیا فائدے ہوں گے؟ ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے دو فائدے صاف دکھائی دیتے ہیں اول تو اس سے کچھ حد تک نوجوانوں کو روزگار ملا ہے اور دوسرا فائدہ یہ کہ اس سے یہاں نئی تکنیک Develop کرنے میں مدد ملی ہے۔ جیسے کپاس (Cotton) کی نئی نسل develop کرنے میں لگی ایک مشہور امریکی کمپنی ''مان سینٹو'' کے لیے کپاس کی نئی قسم کی تیاری ہندوستان میں سستا پڑی تو دوسری جانب ہندوستانی سائنس دانوں کو ایک نئی تکنیک کی جانکاری ہوئی۔ حالانکہ اب تک ہندوستان کی انفارمیشن ٹیکنالوجی انڈسٹری جس تیزی سے چھلانگ لگا کر آگے بڑھ رہی تھی، اب اس کی رفتار کچھ سست ہوگئی ہے۔ آئی ٹی کے تابناک مستقبل پر بزنس پروسیس آؤٹ سورسنگ (B.P.O.) کی نوکریوں کی گنجائش میں کمی آجانے سے فکر مندی دکھائی دے رہی ہے۔ یوں تو ابھی بھی B.P.O. کے 75 فیصدی بازار پر ہندوستان کا قبضہ ہے لیکن امریکی مارکیٹ ریسرچ کمپنی ''فاریسٹر'' کے مطابق ہندوستان کی بی پی او اور انڈسٹریز کی شرح ترقی لگاتار گھٹ رہی ہے۔ جس کی وجہ ہندوستان میں کاروبار کے لیے آئی کچھ ملکوں کی کمپنیاں ناراض نظر آرہی ہیں۔ برطانیہ کی ایز جی کمپنی ''پاور جین'' ہندوستان سے اپنے کال سینٹر (Call Centre) واپس بلا رہی ہے۔ اے. بی بینک کو پچھلے سال بنگلور کے کال سینٹروں کو بند کرنا پڑا۔ اس کے صارفین کو شکایت تھی کہ انھیں اچھی سروس نہیں مل پارہی ہے۔ اس سبب کے باوجود ہندوستان کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے لیے عالمی بازار میں کافی امیدیں ہیں۔ ہندوستان کا سافٹ ویئر اور سروس اکسپورٹ مالی سال 2005-06 کے 33 فیصدی بڑھ کر 23.60 ارب ڈالر ہوگیا۔ اندازہ ہے کہ مالی سال 2006-07 میں سافٹ ویئر اور سروس انڈسٹریز 25.28 فیصدی اضافے کے ساتھ 38.38 ارب ڈالر

ہوجائے گا۔ بلاشبہ آئی ٹی سیکٹر میں ہندوستان کو چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں کی کمپنیاں ہندوستان کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کمپنیوں سے آگے نکلنے کے لیے زور لگا رہی ہیں۔ اس سیکٹر میں چین، جاپان، کوریا، جرمنی، میکسیکو، ساؤتھ افریقہ وغیرہ ممالک کوشاں ہیں۔ ان مسابقتی ملکوں میں بنیادی ضرورتوں کا طویل ڈھانچہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ دبدبہ بڑھانے کے لیے انگریزی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ چین کا دعویٰ ہے کہ اس وقت وہ کمپیوٹر ہارڈ ویئر میں پہلے مقام پر ہے۔ ریسرچ ایجنسی ڈائمنڈ کلسٹر کا کہنا ہے کہ B.P.O. میں ہندوستان کو سب سے بڑا چیلنج چین سے ہی ہے۔ ہندوستان میں آؤٹ سورسنگ کر رہی آدھی سے زیادہ کمپنیاں چین کی طرف رخ کرنے کو تیار نظر آ رہی ہیں۔

ان حالات میں ہندوستان کو اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لیے کئی بنیادی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس کے مواصلاتی رابطہ سہل بنانے ہوں گے، کم خرچ پر بجلی تیار کر کے اسے مسلسل مہیا کرانے کی طرف توجہ دینی ہوگی اور دنیا کے ہر گوشے میں آؤٹ سورسنگ کے لیے زبردست مارکیٹنگ کرنی ہوگی۔ اگر ہم ایسا کر پائے تو کل بھی عالمی سطح پر نمبر ون ہوں گے۔

□□□

پتہ:
Main Dairy Section, Bihar Legislative Council,
Patna-800015

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون "تمہید" کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تنزیل اطہر

آن لائن اردو صحافت

موجودہ زمانے میں زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو انفارمیشن ٹکنالوجی سے متاثر نہ ہو۔ دفتر ہو یا گھر' تجارت ہو یا معیشت' علم ہو یا ادب کوئی بھی اس نئی ٹکنالوجی کی زد سے باہر نہیں ہے۔ ذرائع ابلاغ نے زندگی کی رفتار کو اس قدر تیز کر دیا ہے کہ پوری دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ میں اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ اب انٹرنیٹ بھی شامل ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ ایک ایسا ذریعہ ترسیل ہے جس کی مدد سے آپ گھر بیٹھے دنیا کی تمام اطلاعات اور معلومات محض ماؤس کلک کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔

1960 کی دہائی میں کمپیوٹر اور ٹیلی کمیونی کیشن کے اشتراک نے مواصلاتی نظام میں ایک 'New media' کو جنم دیا جسے ہم web / OnlineJournalism کہتے ہیں۔ 1960 کے شروعاتی عشرے میں کچھ ذہین لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ سائنسی تحقیق کے لیے کئی کمپیوٹروں کو ایک ساتھ جوڑ کر انفارمیشن نیٹ ورک بنایا جائے۔ اس سمت میں سب سے پہلے امریکی پروفیسر J.C.R. Licklider نے 1962 میں کمپیوٹر نیٹ ورک کا عالمی نظریہ پیش کیا۔ ایک پروجیکٹ کے طور پر لارنس رابرٹس نے 1965 میں ٹیلی فون لائن کے ذریعے Massachusetts computer کو California computer سے جوڑنے میں کامیابی حاصل کی اور انٹرنیٹ جسے اس وقت ARPANET کہا جاتا تھا کی بنیاد ڈالی۔ دنیا میں پہلی بار 1969 میں انٹرنیٹ (ARPANET) کو Online کیا گیا۔

انٹرنیٹ پر صحافت کی شروعات 1990ء میں اس وقت ہوئی جب شمالی کیرولینا کی News & Observer کمپنی نے "Nand O Land" نامی نیوز ویب سائٹ بنائی۔ اس کے بعد سے انٹرنیٹ کی دنیا میں لگاتار نئے تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی' اخبار' میگزین اور ٹی وی چینل ہے جس کا اپنا نیوز ویب سائٹ نہ ہو۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے' انٹرنیٹ پر اس کی مدت عشرے سے زیادہ نہیں ہے۔ اردو کو انٹرنیٹ سے متعارف کرانے کی پہلی کوشش 10 مئی 1994 میں ہوئی۔ پاکستان کے سید ظفر کاظمی نے اردو شاعری پر تبادلۂ خیال کے لیے alt.language.urdu.poetry (ALUP) نامی نیوز گروپ بنایا۔ شروعات میں یہ ذاتی webpages سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور اس میں رومن اردو استعمال کی جاتی تھی۔ چونکہ ابتدا میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے اردو سافٹ ویئر نہیں تھا اس لیے زیادہ تر کام رومن اردو میں ہوتا تھا۔ پاکستان ڈاٹا مینجمنٹ سروسز (PDMS) کا اردو سافٹ ویئر 'Urdu98' اور ہندستانی سافٹ ویئر کمپنی Concept software کا 'Inpage' آنے کے بعد اردو کے ویب پیج میں زبردست ترقی ہوئی اور نئے نئے ویب سائٹ وجود میں آئے۔

ورلڈ وائڈ ویب (www) پر اردو کی سب سے پہلی ویب سائٹ urdustan.com ہے۔ یہ ویب سائٹ اگست 1998 میں لانچ کی گئی۔ جبکہ سب سے وسیع اور مقبول عام ویب سائٹ urdu Point.com ہے۔ urdu net کو اردو کا پہلا نیوز پورٹل مانا جاتا ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو اخبارات اور میگزین بھی پابندی سے اپنا انٹرنیٹ ایڈیشن نکال رہے ہیں۔ پاکستان کے مشہور اخبار' جنگ' نے سب سے پہلے اپنا انٹرنیٹ ایڈیشن شروع کیا۔ جرمنی سے نکلنے والی میگزین' جدید ادب' انٹرنیٹ پر شائع ہونے والی دنیا کی پہلی اردو میگزین ہے۔ آج تمام بڑے اخبار اور میگزین اپنا e-edition نکال رہے ہیں اردو میں کچھ ایسے ویب سائٹ ہیں جو خبروں کے لیے وقف ہیں۔ ان میں

alqumqronline,bbcurdu.com, urdunews.net, urduweb.com, urdupoint.com, urdustan.com

بڑے ویب سائٹس ہیں۔

ہندوستان میں 14 اگست 1995 کو VSNL نے ملک میں پہلی بار انٹرنیٹ سروس کا آغاز کیا۔ شروعات میں تین چار سال تک انٹرنیٹ کی دنیا میں VSNL کی اجارہ داری رہی لیکن 1998 میں (IPS Internet process system) پالیسی نافذ ہونے کے بعد اس سمت میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ تجارت، معیشت کے علاوہ انٹرنیٹ کا استعمال خبروں کی ترسیل کے لیے کیا جانے لگا۔ ہندوستان میں خبروں کی پہلی ویب سائٹ بنانے کا کریڈٹ انگریزی اخبار' دی ہندو' کو جاتا ہے۔ ہندو نے 1995 میں اپنا انٹرنیٹ ایڈیشن جاری کیا۔ پونے یونیورسٹی میں کیے گئے ایک ریسرچ کے مطابق 1998 تک ملک میں 48 ایسے اخبارات تھے جن کا انٹرنیٹ ایڈیشن موجود تھا۔

1996 میں rediff نے ہندوستان کا پہلا ویب سائٹ لانچ کیا۔ لیکن خالص news centric website کے طور پر' تہلکہ' نے 2000 میں پہلا news portal شروع کیا۔ اپنی تفتیشی صحافت کی بدولت جلد ہی اس نے انٹرنیٹ صحافت میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ آج ہندوستان کے تمام بڑے اخبارات اور رسالوں کا اپنا' نیٹ ایڈیشن' ہے۔ انگلی کی ایک جنبش سے آپ ان کی ورق گردانی کر سکتے ہیں۔ اخبارات اور رسالوں کے علاوہ خبروں کی ترسیل کے لیے ویب دنیا میں انٹرنیٹ کی بڑی کمپنیاں Google, msn,

Yahoo, rediff موجود ہیں۔ ان کے علاوہ خبروں اور دیگر معلومات کے لیے ریڈیو اور ٹی وی چینلس کے ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو نے بھی جلد ہی World wide web سے اپنے آپ کو منسلک کرلیا۔ آج اردو ویب سائٹ میں بہت تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہاں آپ کو اخبارات اور رسائل کے آن لائن ایڈیشن کے علاوہ ادب وثقافت سے متعلق ایک پوری دنیا ملے گی۔ شعرا، ادبا اور قلمکاروں کی ڈائرکٹری موجود ہے جس کی مدد سے آپ انٹرنیٹ پر ان سے براہ راست واقفیت اور ان کی تخلیقات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ آپ کو مشاعروں سے دلچسپی ہے تو آپ مشاعرے کی ویب سائٹ پر چلے جایئے اور اپنے پسندیدہ شاعر کے کلام کو پڑھ اور سن لیجیے موجودہ شعرا کی نجی ویب سائٹ (blog) کے علاوہ غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض جیسے شعرا کا کلام بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ قومی و بین الاقوامی خبریں، ادبی وثقافتی سرگرمیاں، سائنس، ٹکنالوجی، فلم، فیشن غرض بہت کچھ اردو نیٹ پر موجود ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے حیدرآباد سے نکلنے والے کثیر الاشاعت اخبار 'سیاست' نے 15 اگست 1997 کو اپنا انٹرنیٹ ایڈیشن شروع کیا۔ اردو کا پہلا e-paper ہونے کا شرف بھی اسی اخبار کو حاصل ہے۔ 30 اکتوبر 2004 کو وزیر اعظم من موہن سنگھ کے ہاتھوں اس کا اجرا ہوا۔ آج ملک کے تمام بڑے اردو اخبارات مثلاً انقلاب، منصف، سیاست، اعتماد، ملاپ، اردو ٹائمس، راشٹریہ سہارا کے انٹرنیٹ ایڈیشن موجود ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے انٹرنیٹ ایڈیشن کے علاوہ اردو میں کچھ news portal بھی ہیں جو صرف خبروں کے لیے وقف ہیں۔

ویب دنیا (www) میں روز بروز غیر معمولی ترقی ہو رہی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح انٹرنیٹ نے نہ صرف اردو کے حلقے کو وسیع کیا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ لیکن انٹرنیٹ بازار پر اب بھی انگریزی کی اجارہ داری قائم ہے۔ نئے ذرائع ترسیل میں اردو کو کئی مشکلات کا سامنا ہے۔ ان میں بنیادی ڈھانچے کی کمی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنکشن کا اردو کی بڑی آبادی تک پہنچ سے باہر ہونا، فونٹ اور دیگر تکنیکی مسائل شامل ہیں۔ عام لوگوں کے درمیان آن لائن صحافت کو فروغ ملے اس کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی ڈھانچے (بجلی، کمپیوٹر، براڈبینڈ) کو مضبوط کیا جائے۔ انٹرنیٹ پر اردو ادب وثقافت کے علاوہ دیگر علوم سے متعلق بھرپور مواد مہیا کرایا جائے۔ اردو میں ابھی indiatimes, yahoo, rediff کی طرح تیز رفتار ویب سائٹ کی کمی ہے۔ جہاں سے آپ e-mail بھیجنے کے ساتھ ساتھ خبریں اور دیگر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن صحافت کے مقابلے میں آن لائن صحافت اگرچہ ابھی نوعمری کے مرحلے میں ہے لیکن اردو آن لائن صحافت کو وسعت دینے کے لیے "ورلڈ وائڈ ویب" پر سارے کے سارے مواقع ہمارے منتظر ہیں۔ □□□

پتہ:
109, Jhelum Hostel,JNU, New Delhi-67

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Coucil for Promotion of Urdu Language
Ministry of Human Resource Development,
Department of Higher Education, Govt. of India

دسواں کل ہند اردو کتاب میلہ

تاریخ: 17 تا 25 جنوری 2009
مقام: صابو صدیق پالیٹکنک، بائی کلا، ممبئی
اشتراک: انجمن اسلام، ممبئی
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

کتابیں ماضی کا اثاثہ، حال کا سرمایہ اور مستقبل کی اساس ہیں۔
ملک بھر کے مشہور و ممتاز اردو ناشرین کی شرکت متوقع ہے۔
جگہ کم ہے اس لیے بکنگ پہلے آؤ پہلے پاؤ کی بنیاد پر ہوگی۔
ایک بک سیلر کو دو سے زیادہ اسٹال نہیں دیے جائیں گے۔

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ: 5.12.2008

رابطہ کے لیے رجوع فرمائیں: انچارج بک پروموشن
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔8، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110 066
فون: 26109746 ,26169416 فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com

سید الفت حسین

نیٹ (NET) اردو کی تیاری کیسے کریں؟

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ملک کی کسی بھی یونیورسٹی میں لکچرر بننے کے لیے نیٹ، جے آر ایف، پی ایچ ڈی یا ایم فل کی تکمیل لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اچھے اکادمک کیریئر کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے پیش نظر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (U.G.C.) کے زیر اہتمام نیشنل ایجوکیشنل ٹیسٹ (NET) اور جونیئر ریسرچ فیلو (JRF) کے تحریری مقابلہ جاتی امتحان منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہ امتحان سال میں دو مرتبہ جون اور دسمبر کے مہینوں میں لیے جاتے ہیں۔ ان امتحانوں کا انعقاد ملک کی کئی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ امتحان میں طلبہ اچھا نتیجہ حاصل کرنے کے بعد اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس امتحان میں بیٹھنے کے وہی امیدوار اہل ہیں جنھوں نے ایم اے۔ میں کم از کم پچپن فیصد نمبروں سے کامیابی حاصل کی ہو۔ ایم اے۔ کے فائنل امتحان میں بیٹھنے والے لڑکے بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن انھیں جب NET یا JRF میں کامیابی مل جاتی ہے تو کمیشن کو ایسے امیدواروں کے ایم اے۔ کے اچھے نتیجے کا انتظار رہتا ہے۔ اگر ایم اے۔ کے امتحان کا بہتر نتیجہ سامنے نہیں آتا تو پھر امیدوار کی دعویداری ختم کردی جاتی ہے۔

کمیشن کے ذریعے لیے جانے والے ٹیسٹ دو طرح کے ہوتے ہیں، جو نیٹ اور جے آر ایف کہلاتے ہیں۔ جے آر ایف ہونے پر کمیشن کی جانب سے تحقیقی کام کے لیے ریسرچ اسکالر کو فیلوشپ کے طور پر ہر ماہ ایک مخصوص رقم دستیاب کرائی جاتی ہے جبکہ نیٹ نتیجہ آنے پر کمیشن کی جانب سے مالی تعاون نہیں ملتا لیکن وہ ملک کی ہر یونیورسٹی کی ترجیحی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ جے آر ایف کے لیے عمر کی قید ہے جبکہ نیٹ کے لیے عمر کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ اٹھائیس سال سے عمر تجاوز کر جائے تو جے آر ایف کی سہولت نہیں مل پاتی اور ایسے امیدواروں کو نیٹ میں منتقل کردیا جاتا ہے۔

ملک کی مختلف یونیورسٹیاں جہاں آج کے مقابلہ جاتی دور میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کی اسناد سے سرفراز کررہی ہیں، وہیں ان طالب علموں کے سامنے یو جی سی کے زیر اہتمام قومی سطح پر ہونے والے لکچرر شپ اہلیتی ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کرنا ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے۔ خصوصاً اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے افراد جنھیں اپنے سبجیکٹ پر مضبوط گرفت ہونے کے باوجود اکثر اس ٹیسٹ میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کا سبب پرچۂ اول میں جنرل اسٹڈی (General Study) میں ان کی کمزوری کو قرار دیا جارہا ہے۔

پرچۂ اول میں جنرل اسٹڈی (G.S.) سے متعلق سوالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس میں مقررہ کوالیفائنگ مارکس (Qualifing Marks) کا حصول لازمی ہے۔ ریزننگ (Reasioning) سے متعلق سوالات پوچھے جانے کا مقصد امیدوار کے ذہن کی وسعت اور تہہ داری اور اس کی روشن دماغی کا پتہ لگانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی پرچے میں اقتباس (Passage) اور تعلیمی و تحقیقی موضوعات سے متعلق سوالات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کا بھی مقصد امیدوار کے علمی اور ذہنی شعور کی سطح کو پرکھنا ہوتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ امیدوار میں کسی عنوان یا موضوع پر بولنے یا بحث و مباحثہ کی صلاحیت ہے یا نہیں! اگر کسی نے اپنے موضوع (subject) پر پوچھے گئے تمام سوالوں کے جوابات بہت اچھے ڈھنگ سے دیے ہیں لیکن پرچۂ اول میں مقررہ نمبر لانے سے وہ قاصر رہا تو ایسے امیدوار کے دیگر پرچوں کی جانچ نہیں کی جاتی اور اسے پہلے ہی مرحلے میں مسترد کردیا جاتا ہے۔ اس لیے جنرل اسٹڈی کی تیاری کے لیے اچھی کتاب کا انتخاب ضروری ہے۔ اس کے لیے P.O. Banking یا S.S.C., UDC امتحان میں آنے والے امکاناتی سوالات کی سیریز بک (series Book) نہایت کارآمد اور فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ ریزننگ سے متعلق سوالات زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن نہیں ہوتے، انھیں عموماً لڑکے بآسانی حل کرلیا کرتے ہیں لیکن اس میں وقت کی پابندی ہوتی ہے اور وقتِ معینہ میں ہی پرچہ حل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے الگ الگ سیریز بک (ریزننگ سے متعلق) کی پریکٹس کرنی چاہیے۔ بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتباسات سے پوچھے گئے سوالوں کے سبھی آپشن صحیح ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا، کسی ایک ہی پر صحیح کا نشان لگانا ہوتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو چاہیے کہ چاروں دیے گئے جوابوں پر غور و خوض کریں اور سوال کے مطابق جو سب سے قریبی جواب نظر آئے اس کی نشاندہی کریں۔ اقتباس کو دو سے تین بار اچھی طرح پڑھ لینا چاہیے۔ اس پرچے میں ٹیچنگ اپٹی ٹیوڈ (Teaching Aptitute) سے بھی کئی سوالات ہوتے ہیں ان کے لیے نیٹ کی جی ایس کی تیاری کے لیے نکلنے والی کسی بھی گائڈ سے مدد لی جاسکتی ہے۔

جنرل اسٹڈی کے پرچے کے ساتھ ہی اس نشست میں طالب علموں کی طرف سے لیے گئے سبجیکٹ سے متعلق معروضی سوالات کے پرچے بھی دیے

جاتے ہیں۔ جن میں پچاس سوالات ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے طالب علم اگر کمیشن کی جانب سے بھیجے گئے نصاب (Course of Study) کا گہرائی سے مطالعہ کرلیتے ہیں تو ان میں سے اکثر سوالوں کے صحیح جواب بآسانی دیے جاسکتے ہیں۔ اس پرچے میں کچھ سوالات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا حل اردو زبان و ادب کی پرانی کتابوں میں ملنا محال ہوتا ہے۔ یہ سوالات اردو زبان وادب سے متعلق ملنے والے اعزازات و انعامات، اردو میں شائع ہونے والی نئی مشہور کتابوں اوران کے مصنفین، رسائل اوران کے مدیران سے متعلق ہوتے ہیں۔ ریاستی وقومی سطح پر چلنے والی تحریکوں سے متعلق سوال بھی پوچھے جاسکتے ہیں۔ ایسے سوالوں کا جواب دینے میں قومی و بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والے اردو رسائل بہت مدد کرتے ہیں۔ اس لیے آج کل دہلی، اردو دنیا، دہلی، ایوان اردو، دہلی، اردو ادب، دہلی، فکروتحقیق، دہلی، کتاب نما، دہلی زبان و ادب، پٹنہ جیسے رسالوں اور اردو روز ناموں کے ادبی صفحات پر گہری نظر ضروری ہے۔

اس ٹیسٹ کا تیسرا پرچہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اس کے لیے دوسو نمبر متعین ہیں۔ اس پرچے کا امتحان لنچ کے وقفے کے بعد دوسری نشست میں ہوتا ہے۔ اس میں کل چھبیس سوالات ہوتے ہیں جو چار حصوں اور دو گروپ میں منقسم ہوتے ہیں۔ گروپ 'A' میں دو حصے اور گروپ 'B' میں دو حصے ہوتے ہیں۔ گروپ 'A' کے پہلے حصے سے پانچ اور گروپ 'B' کے دوسرے حصے سے پندرہ سوال آتے ہیں۔ ہرسوال کا جواب تیس الفاظ میں دینا ہوتا ہے۔ ہرسوال کے لیے پانچ۔ پانچ نمبر مقرر ہیں۔ یعنی اس حصے میں کل بیس سوال ہوتے ہیں جن کے لیے سونمبر مختص ہیں۔

اس پرچے کا تیسرا حصہ اختیاری ہوتا ہے جو special core کہلاتا ہے۔ اس کے لیے ساٹھ نمبر رکھے گئے ہیں۔ دوسرے حصے کے 'B' گروپ میں کئی موضوعات ہوتے ہیں مثلاً دکنی ادب، تحقیق وتنقید، اردو ادب 1935 کے بعد، سرسید وغیرہ۔ یہ موضوعات اختیاری ہیں ان میں کسی ایک موضوع کا انتخاب کرکے پانچ سوالوں کا دوسو الفاظ میں جواب دینا ہوتا ہے۔ اس گروپ کا آخری حصہ تفصیلی مضمون پرمبنی ہوتا ہے جو چالیس نمبر کا ہوتا ہے۔ اس میں ایک ہزار لفظوں پر مشتمل صرف ایک سوال کا جواب تفصیل سے دینا ہوتا ہے یہ سوال اردو سے متعلق کسی بھی عام موضوع پر پوچھا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ یو جی سی کے اردو نصاب کے مطابق کئی کتابیں دہلی، پٹنہ، علی گڑھ وغیرہ سے منظرعام پر آچکی ہیں جن سے اس امتحان میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

□□□

پتہ:
C/o Moul. S. Asad Raza
Imambandi Begum Waqf Estate,
Moh+P.O. Gulzarbagh, Distt. Patna,
Bihar-800007

”کلیات سعادت حسن منٹو“ — جلد اوّل

مرتب: شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی وادبی سرمایے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کلیات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ”کلیات سعادت حسن منٹو“ کی اس پہلی جلد میں ”آتش پارے“، ”منٹو کے افسانے“ اور ”دھواں“ کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات — 565، قیمت — 285 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد حسن (ہماری مطبوعات سے)

افلاطون کا تنقیدی نظریہ

افلاطون کو فن اور شاعری کا سب سے سنگ دل نقاد کہا جاتا ہے اس کے باوجود جس قدر شاعرانہ انداز بیان پر جتنا قابو اور الفاظ کا جتنا ساحرانہ استعمال افلاطون کے ''مکالمات'' میں ملتا ہے اتنا کسی اور فلسفی کی تصنیف میں نہیں ملتا۔ فلسفہ افلاطون کے نزدیک مردہ حقائق کا خشک اور بے مغز اظہار نہیں ہے بلکہ حسن، صداقت اور احساس و ادراک کی وہ اعلیٰ ترین منزل ہے جہاں انسان کی روح سچے انبساط سے روشناس ہوتی ہے۔

افلاطون کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اس نے آرٹ کے صحیح سماجی مرتبے کو سمجھنے میں غلطی کی، فن ''کو نقل کی نقل'' قرار دیا اور اسے صداقت سے تین منزل دور بتا کر اسے اپنی تصوراتی جمہوریت سے دیس بدر کر دیا لیکن یہ افلاطون کے نقطۂ نظر کا محض ادھورا اور غیر منصفانہ بیان ہے کیونکہ نہ تو اس سے وہ فکری پس منظر واضح ہوتا ہے جس میں افلاطون نے شاعری اور فن کو پرکھا ہے اور نہ اس خدمت کا ذکر ہوتا ہے جو فن اور فلسفے کے باہمی رشتے کو واضح کرنے میں افلاطون نے انجام دی ہے۔

یہ بات یاد دلا دینا شاید اس جگہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ یونان کی شہری ریاستوں کی جمہوری تہذیب میں آرٹ کو جمالیاتی اعتبار سے پرکھنے کی بجائے اخلاقی اور افادی اعتبار سے پرکھا جاتا تھا۔ فن کو اخلاقی اور سماجی صداقتوں کا نہ صرف ذریعۂ اظہار خیال کیا جاتا تھا بلکہ ان کے پرچار اور تبلیغ کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں فن کو پرکھنے کا کم و بیش وہی معیار بنیادی حیثیت رکھتا تھا جیسے ارسطوفینس نے یوری پی ڈیس کی زبانی بیان کیا ہے کسی داستان یا ادبی شہ پارے کی تعریف و تفسیر میں سب سے زیادہ اہمیت اس نکتے کو حاصل تھی کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سچ ہے یا نہیں ''مکالمات'' میں سقراط کی زبانی افلاطون نے اسے ایک مثال سے واضح کیا ہے۔ وہ فیڈرس سے کہتا ہے:

''اگر میں جنگ میں کام آنے کے لیے ایک گھوڑا خریدنے کی ترغیب دینے لگوں مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی گھوڑے کی شناخت نہ رکھتا ہو مجھے صرف اسقدر معلوم ہوا کہ میرے دوست فیڈرس کو یقین ہے کہ گھوڑا ایک ایسے پالتو جانور کو کہتے ہیں جس کے بڑے لمبے کان ہوتے ہیں — اور اگر میں بڑے سنجیدہ ترغیب دینے والے لہجے میں گدھے پر ایک تقریر شروع کردوں جس میں اسے گھوڑا قرار دوں اور بتاؤں کہ یہ بے پناہ فائدہ کا جانور ہے اور نہ صرف گھر کے کاموں میں مفید ہوتا ہے بلکہ جنگ کے میدان میں بھی کام آتا ہے اور اس پر چڑھ کر آسانی سے جنگ لڑی جاسکتی ہے اور سامان لادا جاسکتا ہے اور ہزاروں دوسرے کام ہوسکتے ہیں۔''

Everyman's Edition ed. J. Wright فیڈرس۔ ص-25، باب-26

اس سوال سے سقراط نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس بات کی ترغیب دی جائے وہ اہم ہے، انداز ترغیب اہم نہیں ہے۔ علاوہ بریں بات کی صداقت اس پر منحصر ہے کہ ترغیب دینے والا کس حد تک شے کی ماہیت اور حقیقت سے واقف ہے۔ اگر اس کا بیان صحیح ہے اور وہ انسانی زندگی کی قدروں کی ماہیت سے واقف ہے جبھی اسے سماجی زندگی میں کوئی مقام حاصل ہوسکتا ہے اور جس شخص کو انسانی زندگی اور کائنات کا یہ ادراک ہوا، سقراط اس فن کار کو ایک شاعر سے زیادہ ''حکیم'' اور ''فلسفی'' کہنا پسند کرتا ہے۔

اب ایک نظر افلاطون کے اس تصور کائنات پر بھی ڈالنا چاہیے جس کا ادراک وہ ہر شاعر اور فن کار کے لیے ضروری قرار دیتا ہے (Phaedo) فیڈو میں سقراط نے روح اور اس کی بقا پر بڑی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ کائنات دو قسم کی اشیا سے معمور ہے۔ ایک وہ ہیں جنھیں حواس خمسہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے جو ہماری رنگ و آہنگ کی دنیا میں مادی وجود رکھتی ہیں اور یہ تمام تر اشیا برابر تغیر و تبدل، فنا اور عدم کی کشمکش میں گرفتار رہتی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جنھیں حواس خمسہ سے محسوس نہیں کیا جاسکتا اور جن کا وجود غیر مادی اور غیر ارضی ہے ان کا احساس محض روح سے کیا جاسکتا ہے اور ان کا وجود تغیر سے بالاتر اور فنا کی دسترس سے باہر ہے وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی جس طرح انسان کا جسم اور اس کی روح۔ اول الذکر برابر فنا پذیر ہوتے رہتے ہیں اور آخر الذکر تبدیلی اور فنا سے بالاتر ہے۔

''تنقیدی تصورات کی تاریخ'' سے ماخوذ، ترتیب و تدوین: محمد حسن / صفحات۔404، قیمت: -/28روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

اس طرح تمام تر غیر مادی اشیا ایک یعنی اور ماورائی روح ہیں جسے idea یا تصور کہا جاسکتا ہے۔ یہ تصور تغیر و فنا سے بالاتر ہے اور مادی اشیا محض اس ماورائی روح کی نقل ہیں اصل علم انھی ماورائی تصورات یا اصلی اشیا کا علم ہے جو حواس خمسہ سے حاصل ہوتا ہے، ظاہری اور سطحی ہے۔

''فلسفہ ظاہر کرتا ہے کہ اشیا کا وہ علم جو آنکھیں سے حاصل کیا جاتا ہے نہایت غلط ہوتا ہے اور وہ بھی جو کانوں یا دوسرے حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔''

افلاطون دراصل ایک ماورائی دنیا کی حقیقت کا قائل ہے اور تمام ظاہری اور حواس خمسہ سے محسوس کی جانے والی اشیا اس حقیقت کا عکس ہیں اور اسی تصور پر قائم ہیں۔

''تصور'' کے بارے میں بھی قابل توجہ ہے کہ افلاطون نے اسے محض حقیقت اولی ہی نہیں سمجھا ہے بلکہ حسن حقیقی بھی قرار دیا ہے۔ ''سمپوزیم'' میں سقراط جو افلاطون کا ذریعۂ اظہار ہے مختلف لوگوں کے ساتھ ساتھ خود بھی حسن و عشق کی ماہیت پر تقریر کرتا ہے اور اپنے نتائج کو حسب معمول مکالمات کے انداز میں ظاہر کرتا ہے پہلے اپنی بحث میں سقراط اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ حسن کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک ناقص اور سطحی جسے تغیر زوال اور فنا سے سابقہ رہتا ہے، دوسری جو حقیقی لازوال اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ پھر ثابت کرتا ہے کہ عشق دراصل وہ خواہش ہے جو انسان میں اپنے حسن خیال (Excellences) کو غیر فانی کرنے کے لیے پیدا ہوتی ہے، جس طرح عام انسان افزائش نسل کے ذریعے مسرت اور بقا قائم کرنے کے لیے عورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس طرح فن کار اپنے تصور کو غیر فانی بنانے کے لیے خوب صورت ہیئت اور ذرائع اظہار کی طرف راغب ہوتا ہے۔

آہستہ آہستہ اوراک انسان کو ہیئت یا ذرائع کے حسن سے ''خوب تر'' اور ''اعلیٰ تر'' حسن کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ ایک مخصوص محبوب کی بجائے اس کی سیرت یا ذہنی بالیدگی (Intellectual Excellences) کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر ذہن جسم یا ظاہری پیکر سے ہٹ کر سیرت اور روحانی عناصر کی طرف جاتا ہے اور پھر ذہن جسم یا ظاہری پیکر سے ہٹ کر سیرت اور روحانی عناصر کی طرف جاتا ہے اور اس شکل میں عاشق یا عارف کا تصور اس حسن کی طرف جاتا ہے جس کے یہ سارے مادی مظاہر صرف اشارے اور علامتیں ہیں وہ حسن حقیقی اصل، غیر فانی اور غیر تغیر پذیر ہے اور دوسری تمام تر اشیا کی طرح اس کا کوئی حصہ بھی بدنما یا ناقص نہیں ہے۔ یہ حسن حقیقی کسی خوب صورت ہاتھ یا کسی حسین حصۂ جسم کی شکل میں تصور کیا جاسکتا ہے نہ کسی فن یا بیان کی صورت میں نہ اس کو کسی ذریعۂ اظہار کی ضرورت ہے اور نہ زمین اس کا مسکن ہے نہ آسمان نہ کوئی اور جگہ، وہ ہمیشہ سے یکساں اور غیر تغیر پذیر ہے اور اپنے طور پر یکتا ہے (monocidic) تمام دوسری اشیا اس کی شرکت اور واسطے کی بنا پر خوب صورت ہیں۔

(سمپوزیم ص-6 (باب 211)

ظاہر ہے کہ انسان کے لیے خوب صورتی کا پہلا اور آخری معیار یہی حسن کامل ہوسکتا ہے اور حسن کاری کی صرف یہی صورت ممکن ہے کہ انسان بجائے نقلی، فانی اور مادی اشیا میں الجھنے کی غیر فانی حسن سے رابطہ پیدا کرے اور اس کی نقل کرے اس رابطے کی شکل میں مادی اور حواس خمسہ کے واسطے کی نہ ہوگی بلکہ روحانی اور ذہنی ہوگی۔ حواس خمسہ سے جن اشیا کا علم حاصل ہوسکتا ہے ان کو افلاطون پہلے ہی ناقص اور غلط قرار دے چکا ہے اور پھر روحانی اور ماورائی تصور حسن کا ادراک محض روحانی ذرائع سے کیا جاسکتا ہے چنانچہ آگے چل کر اسی مکالمے میں سقراط کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں:

''وہ لوگ جو اس طور پر اپنی تربیت اور تنظیم کرتے ہیں اور اس طرح حسن کی ظاہری اور مادی شکلوں سے حسن کامل تک پہنچتے ہیں۔ پہلی منزل سے دوسری منزل تک اور دوسری سے حسن کی تمام تر شکلوں تک اور پھر خوب صورتی کی شکلوں سے خوبصورت اعمال و اطوار تک اور پھر اعمال و تصورات سے خوب صورت افکار تک رسائی حاصل کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان افکار پر غور و فکر کرنے کے بعد اس نقطۂ تصور تک پہنچ جاتے ہیں جو حسن کامل ہے اور اس حسن کامل کی بصیرت اور گیان میں وہ آخر کار مگن ہو جاتے ہیں۔''

سمپوزیم ص-6 (ب 211)

اور ان لوگوں کو افلاطون ''حکیم'' یا فلسفی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے: "Love is that which thirsts for the beautiful, so that Love is Nature as seen by a philosopher, philosophy being an intermediate state between ignorance and visdom"

Symposium p. 52 (204)

عشق دراصل حسن کی تمنا ہے لہٰذا عشق لازمی طور پر فلسفہ سے ہم آہنگ ہے کیونکہ فلسفہ جہالت اور عقل کے درمیانی مدت کا نام ہے۔''

یہاں واضح طور پر افلاطون حسن اور حقیقت نہیں ہے بلکہ اخلاقی اور ماورائی تصور ہے۔ لہٰذا افلاطون کے نزدیک حسین شے کا اخلاقی طور پر پاکیزہ ہونا لازمی ہے یا یوں کہیے کہ ''حسن اخلاقی افادیت کا دوسرا نام ہے۔ حسین شہ پارہ صرف اسی صورت میں حسین کہا جاسکتا ہے جب وہ اخلاقی طور پر اچھی تعلیم دے سکے اور انسانوں کے لیے براہ راست مفید ہو۔''

اس طرح افلاطون کے تصورِ حسن کے لیے اخلاقیات اور افادیت لازمی عناصر ہیں ابن رشیق نے شعر کی تعریف اس طرح کی تھی جسے سن کر سننے والے کہیں کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے وہی شعر اس حسن اور صداقت کے درجہ کے لحاظ سے افلاطون کے نزدیک وقیع ہے جو کائنات کی بصیرت اور حقیقت اعلیٰ اور حسن کامل کے ماورائے احساس ادراک سے معمور ہوتی ہے۔ فیڈرس ہی میں یہ بیانات ملتے ہیں:

''بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ مقرر جس چیز کا ذکر کرے وہی حقیقت ہو۔ حقیقت کا علم لوگوں کو ترغیب دینے کا فن نہیں سکھاتا لیکن حق سے الگ ہو کر صحیح معنوں میں ترغیب نہیں دی جاسکتی۔''

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

''شاعر، مقرر یا قانون داں اگر حق پر اپنی تصانیف کی بنیاد رکھیں تو وہ فلسفی کہلانے کے مستحق ہیں۔''

لیکن جہاں فن کار فلسفی بننے سے منکر ہوتا ہے اور اس کا دائرۂ فکر کائنات اور اس کے وجود حسن کامل اور اس کے ماورائی ادراک سے متعلق نہیں ہوتا اور وہ محض جمالیاتی آسودگی کے لیے اپنے فن کو استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے افلاطون کے سماج میں کوئی جگہ نہیں۔

وہ ایسے تمام فنون کو جو حقیقت کے ماورائی اخلاقی اور غیر حسی درک سے پیدا نہیں ہوتے، قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا کیونکہ یہ تمام فنون دراصل ان ٹھوس مادی اشیا اور اس نظر آنے والے عالم اسباب کی نقل کرتے ہیں جو عالم تصور کی محض نقل ہے یا اس کا ناتمام عکس ہے۔ چنانچہ نظر آنے والی دنیا کی اور اس کی اشیا کی نقل حقیقت سے دور ہے اور ایسا تمام علم و ادراک نقل کی نقل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

نقل کی اصطلاح، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، یونانی علوم میں برابر استعمال ہوتی رہی ہے اور انسانوں کے عملی، سماجی اور انفرادی زندگی میں ان اصولوں کی نقل اور پیروی پر برابر زور دیا جاتا رہا ہے جو فطرت کے اصول کہے جاسکتے ہیں اور جن کے اعتبار سے موسموں کی تبدیلی، رات اور دن کی گردش اور پھلوں، پودوں کی نشو و نما جاری ہے گویا حکمت اور فلسفہ کا کام مادی زندگی کو ماورائی تصورات کے مطابق ڈھالنا ہے یا یوں کہیے کہ فلسفہ، ماورائی حقیقت کو عالمِ تصور سے زمین پر لاکر مادی صورت بخشتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان فلسفے کے ذریعے سے عالمِ تصور کا درک حاصل نہ کرلے۔

فن، خواہ رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ یا ''حرف و صوت'' ہر حالت میں اس دنیا کی ''نقل'' کرتا ہے جو انسان کی نظروں کے سامنے پھیلی ہے اور فن کار کی رسائی حقیقت تک صرف انہی مادی ذرائع سے ہوسکتی ہے جو حواس کے ذریعے سمجھے اور جانے جاتے ہیں۔ اس صورت میں افلاطون کے نظریے کے مطابق نہ تو وہ اشیا حقیقی ہوسکتی ہیں جن کی فن نقل کرتا ہے (کیونکہ مادی اشیا اور عالم اسباب محض اصل کی نقل ہے) اور نہ وہ علم سچا ہوسکتا ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اور ایسی اشیا سے تعلق رکھتا ہے جو غیر حقیقی ہیں وہ تمام علوم و فنون جو اس زمرے میں آتے ہیں افلاطون کے نزدیک سطحی اور ضمنی ہیں۔

آرٹ افلاطون کے نزدیک دونوں اعتبار سے سطحی اور غیر حقیقی ہے اس بنا پر کہ وہ مادی زندگی کی نقل اس سطحی علم کے ذریعے سے کرتا ہے جو اسے حواس کی مدد سے حاصل ہوتا ہے دوسرے اس کا مقصد بھی حواس کے ذریعے انسانوں کو آسودگی بخشنا ہے البتہ افلاطون کی اس خدمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو فن کی حد بندی کرکے اس نے انجام دی ہے۔

پہلے تو اس نے فن کے مختلف شعبوں میں ایک یگانگت کا پتہ لگایا اور آرٹ کے تمام شعبوں کو اس بنیادی اشتراک کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط کردیا کہ یہ سب مختلف ذرائع سے مادی زندگی کی نقل کرتے ہیں۔ یہی نہیں اس سے آگے بڑھ کر افلاطون نے اس کے ذرائع اظہار کے فرق کو ملحوظ رکھا اور بتایا کہ مصوری، رنگ کے ذریعے سے نقل کرتی ہے تو سنگیت صوت و آہنگ کے ذریعے اور ادب اور شاعری، حرف و وزن کے ذریعے مجسمہ سازی پتھر اور کنی سے فن کے مختلف شعبوں میں ربط باہمی کی یہ پہلی فلسفیانہ بنیاد تھی جسے افلاطون نے فراہم کیا اور اگر ہم ان مباحث کو پیش نظر رکھیں جو کئی صدی بعد لسنگ ونکل مین اور دوسرے نقادوں کے زیر اثر اس موضوع پر ہوئے اس مختصر سے بیان کی اہمیت کا تو بہتر طور پر اندازہ ہوگا۔

دوسرا نظریاتی اضافہ افلاطون کے اس تنقیدی بیان نے کیا جو اس نے الزامی طور پر فن کے بارے میں دیا ہے۔ فن کے تمام تر شعبوں کا مقصد فطرت کی نقل ہی نہیں ہے بلکہ انبساط فراہم کرنے کے لیے نقل کرنا ہے اور انبساط کا لفظ یہاں نہایت تحقیر کے ساتھ استعمال ہوا ہے جسم اور مادی وجود افلاطون کے نزدیک سطحی غیر حقیقی اور کم تر درجے کی چیزیں ہیں اور ظاہر ہے کہ جسمانی حواس کو انبساط بخشنے والی اشیا بھی سطحی اور کم تر درجے کی ہوں گی لیکن فن پر لگایا ہوا یہ الزام حقیقتاً آرٹ کے ایک بنیادی مقصد کو واضح کرتا ہے فلسفیانہ تعلیم دینے والے بیانات یا صداقت اور حقیقت کا اظہار کرنے والے الفاظ صرف اس بنا پر فن کے احاطے میں داخل نہیں ہوسکتے کہ جو کچھ ان میں کہا گیا ہے وہ سچ ہے بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ انبساط بخشتے ہوں جسے ہم اپنی اصطلاح میں ''جمالیاتی آسودگی'' بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ فن کی تنقید کا وہ پہلو ہے جسے ارسطو، لمنس اور ہومر کے بیانات میں بھی تقریباً نظر انداز کردیا گیا تھا۔ ہیئت اور اظہار بیان کا یہ مسئلہ تاریخ تنقید میں حقیقتاً اہم ترین ثابت ہوا ہے۔

افلاطون کا تیسرا تنقیدی کارنامہ "نقل" (Mimesis) کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ یہ لفظ پہلی بار فن کے سلسلے میں اسقدر شرح و بسط کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ افلاطون او رارسطو کا مقابلہ کرتے ہوئے دونوں کے نظریۂ تصنیف کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ افلاطون نے شاعری پر علیحدہ کوئی کتاب نہیں لکھی اس کا مقصد فن اور ادبیات پر علاحدہ بحث کرنا نہیں ہے، فن اور شاعری اس کا موضوع بھی نہیں ہے۔ افلاطون فن کی افادی اور سماجی حیثیت پر غور کرتا ہے۔ اس کا موضوع آرٹ نہیں انسانی سماج ہے اور اس سماج کی تشکیل میں مختلف گروہوں کا، علوم اور فن کا، جو درجہ ہوگا اس کا تعین افلاطون کی "جمہوریہ" کا موضوع ہے اس صورت میں افلاطون کے سامنے ہر ایک شے کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شے کس حد تک سماجی طور پر مفید ہے؟

یہ معیار اس دور میں اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے جب شعرا کو محض انبساط بخشنے والے موسیقار سمجھنے کے بجائے معلم اور اتالیق سمجھا جانے لگا تھا۔ اس دور کے یونان میں جب آتش بیاں مقرروں کی تقریریں، اسٹیج پر ساری رات کھیلے جانے والے ڈرامے، اور کوچہ و بازار میں گونجنے والے نغمے سماج اور سیاست، مذہب اور اخلاق، رائے عامہ اور سماج کے دھارے کو پلٹ رہے تھے، افلاطون کے اس احتساب کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور تھا۔

افلاطون فن پر صرف اسی وجہ سے معترض نہیں ہے کہ یہ فلسفیانہ اعتبار سے عقل کی نقل ہے بلکہ اس کا اعتراض یہ بھی ہے کہ شعروسخن، مصوری اور سنگیت عقل کی بجائے جذبات سے اپیل کرتے ہیں اور ہوشمندی اور ذہن رسا کی جگہ انسان کے سفلی وجود کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں شاعری اور ڈرامے میں دیوتاؤں کو نہ صرف انسانوں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے بلکہ ان سے وہ تمام افعال سرزد ہوتے دکھائے گئے ہیں جو ان کے تقدس اور عظمت کے شایان شان نہیں ہے اور جن سے عوام پر غلط اثرات مرتب ہونے کا احتمال ہے۔

دیوتاؤں کو یونان کے اعلیٰ ترین شاعروں نے بھی انسانوں کے روپ میں پیش کیا اور اس طرح ان کے یہاں انتقام، خواہش، جنگ اور بے رحمی کے جذبات بھی ملتے ہیں۔ افلاطون سرمدی دنیا کے بارے میں اس رویے اور دیوتاؤں کے اس روپ میں پیش کرنا اور اخلاقی قیدو بند سے آزادی کو اخلاقی طور پر گناہ قرار دیتا ہے اور چونکہ آرٹ اس ذہنی اور جذباتی پابندی اور ضابطہ بندی کے خلاف انسانوں کو ترغیب دیتا ہے اس لیے افلاطون کی جمہوریت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

افلاطون کی یہ تنقید بیک وقت فن کی تنقیص بھی ہے اور تعریف بھی۔ تنقیص اس اعتبار سے کہ شاعر معلم اخلاق کے اس درجہ پر مطمئن ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے جو افلاطون اسے بخشنا چاہتا ہے اور تعریف اس وجہ سے کہ انسان کے جذبات کو کچلنے والی ضابطہ بندی سے فن کار بغاوت کرتے آئے ہیں اور ایسے لمحات میں بھی جب سماج کے لیے قانون بنانے والے یہ سمجھ کر مطمئن ہوگئے ہیں کہ ان کا بنایا ہوا ضابطہ معیاری اور تصوراتی ہے اس وقت بھی ان مسلمہ صداقتوں کے خلاف تشکیک کا علم فن کاروں نے ہی بلند کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانی تہذیب کو آگے بڑھنے کے لیے ہنوز نئی منزلیں باقی ہیں۔

افلاطون کا اعتراض محض فن کاروں کے لاابالی پن اور ذہنی غیر ذمے داری ہی پر نہیں ہے بلکہ وہ ان پر یہ غیر اخلاقی تعلیمات دینے یا اخلاقی ضابطے سے بے پروائی برتنے کی ترغیب عام کرتے ہیں۔ یہ رویہ بڑا تنگ نظری کا رویہ معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو ہر عہد میں ادب اور فن پر اخلاقی احتساب اور سماجی ذمے داری کے نقطۂ نظر سے گرفت ہوتی رہی ہے لیکن افلاطون سب سے پہلا عظیم فلسفی ہے جس نے صرف اسی معیار پر پرکھ کر شاعری اور فن کو اپنی تصوراتی جمہوریت سے نکال باہر کیا۔

ادب اور فن کس حد تک سماج کے لیے اخلاقی طور پر یا کسی اور طریقے پر مفید ہوسکتے ہیں۔ یہ سوال کئی صدیوں بعد بڑی اہمیت اختیار کرگیا اس کے باوجود کہ افلاطون نے اس کا جواب نفی میں دے کر صرف فلسفیوں کو انسانی زندگی کا مہتمم قرار دے دیا اور ریاست اور مذہب تک کی باگ انھیں کے ہاتھ میں دے دی لیکن ہر عہد کے شاعر اور فن کار اپنے کو اس عظیم عہدے کا مستحق بتاتے رہے ہیں۔

شیلے نے شعرا کو بنی نوع انسان کا غیر مسلمہ قانون ساز کہا تھا خود سقراط نے ہومر کے لیے "سماوی شاعر" کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن افلاطون فن کاروں کو الہامی اور سماوی درجہ دینے کے باوجود سماجی طور پر غیر مفید اور بے کار قرار دیتا ہے۔

اس کے لیے افلاطون کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فن کار کے بیانات حقیقی اور سائنٹیفک نہیں ہوتے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے عقل و فہم کی مدد سے نہیں کہتا اکثر وہ خود نہیں جانتا کہ اس کے پاس کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں بلکہ وہ صرف ایک ماورائی طاقت یا سماوی الہام یا کسی جنون کے زیر اثر یہ باتیں کہتا ہے اور اس کے لیے ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ جب بیانات بہ ثبات عقل و ہوش نہ دیے جائیں گے تو ان سے کسی قسم کی سماجی افادیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

Ion میں سقراط ہومر کے مشہور مفسر سے کہتا ہے کہ "شاعر دراصل خوبصورت گیت سماوی جنون کے عالم میں تخلیق کرتے ہیں۔ کوری بنٹیز کے بونوں کی طرح جو مقدس رقص میں عقل و فہم پر اپنا سارا اختیار کھو بیٹھتے اور اس ماورائی اثر کے دوران آہنگ اور سنگیت کی تخلیق اور ترسیل کرتے ہیں۔" ایک

دوسری جگہ وہ اس کو یزدانی اثر divine influence سے تعبیر کرتا ہے جو شاعروں میں اس طرح موجود ہوتا ہے جیسے "مقناطیس میں کشش کی طاقت" اور جو کسی قسم کے اکتساب یا کاریگری سے حاصل نہیں ہوتی۔ ایک اور جگہ شاعروں کو "جاہل اور نا قابل" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "خدا نے جان بوجھ کر ان لوگوں کو پیغمبروں اور پیش گوئی کرنے والوں کی طرح عقل وفہم سے عاری کر دیا ہے تاکہ وہ سماوی پیغام ہی کے آلۂ کار بنے رہیں۔" Phaedus میں جنون کی قسمیں گناتے ہوئے سقراط پیشین گوئی، ساحری، پیغمبری اور محبت کے ساتھ شاعری کو بھی شامل کرتا ہے۔ اس طرح افلاطون کے نزدیک شعرا کی باتیں اور ان کے بیانات محض ایک مقدس دیوانگی کی تخلیق ہیں۔ ان میں عقل کا عنصر برائے نام ہی ہوتا ہے انھیں دانش مندی کہنا غلط ہے، ان میں حکیمانہ توازن اور تفکر موجود نہیں ہوتا اور اسی بنا پر وہ صرف بے ہودہ اور بے مقصد کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ عقل کی رسائی اور فکر کی گہرائی پر جذبات اور حواس کے ہنگامی ارتعاش کو ترجیح دے کر وہ عقل دشمن قرار پاتی ہیں اور انسان کے ذہن کو صحیح راستے سے ہٹا کر اس کے حیوانی وجود کو نمایاں کرتی ہیں۔

افلاطون نے شاعری کے عمل کے سائنٹفک تجزیے کی کوشش نہیں کی ہے اور یہاں بھی وہ ان تمام نقادوں کا پیش رو ہے جو اس کی طرح فن اور شاعری کو خلاف تہذیب اور مخرب اخلاق تو قرار نہیں دیتے لیکن شاعری کو سماوی پیغام سمجھتے ہیں اور تخلیقی عمل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کو فضول بتاتے ہیں۔ تخلیقی عمل کو وہ بھی افلاطون کی طرح پُر اسرار اور سماوی قرار دیتے ہیں۔

آخر میں افلاطون کے اہم ترین نکتے پر غور کرنا چاہیے جو ابتدائی تنقید کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ افلاطون نے فن اور خاص طور پر شاعری کو "نقل کی نقل" قرار دیا ہے یہاں تھوڑی دیر کے لیے یہ بات نظر انداز کر دینی چاہیے کہ افلاطون کی مابعد الطبیعات اس عالم اسباب ہی کو "نقل" مانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فن کے سلسلے میں نقل کا تصور افلاطون کو کہاں سے ملا اور کس حد تک وہ درست ہے۔

یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ یونانی حکما فطرت ہی کو سارے قوانین کا ماخذ سمجھتے تھے اور فطرت کے قوانین کا دریافت کرنا اور ان کے مطابق انسانی زندگی کے لیے ضابطے قائم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پھر جیسا کہ پروفیسر گلبرٹ مرے نے ارسطو کی بوطیقا کے دیباچے میں لکھا ہے "اعلیٰ یونانی شاعری من گھڑت قصے بیان نہیں کرتی تھی بلکہ قدیم صنمیاتی ہیرو اور اس کی مہمات کی داستانیں قلم بند کرتی تھی۔" Poets کا لفظ بنانے والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور چونکہ شاعر حقیقت میں قصے بنانے والا نہ ہوتا تھا بلکہ اصلی قصوں کو محض دہرانے والا ہوتا تھا شاید اس کے لیے افلاطون اور ارسطو دونوں اسے ناقل کہتے ہیں اور آرٹ کو نقل Memisis اگر افلاطون کے نظریۂ نقل کو ان معنوں میں لیا جائے کہ آرٹ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے اور ایسے مناظر کو بیان کرتی ہے جو عملی زندگی میں مختلف قسم کے انسانوں کو مختلف ادوار میں پیش آتے رہے ہیں تو اس سے اختلاف کی زیادہ گنجائش پیدا نہیں رہتی۔ لیکن اگر نقل سے یہ مراد ہے کہ آرٹ محض زندگی کا ایک ضمنی اور ثانوی عکس ہے تو اس توجیہہ کو پوری طرح تسلیم کرنا دشوار ہے اس کے حامی کہیں گے کہ فن کار یا مصور ایک ہرن کو دیکھتا ہے اور اس کی تصویر اس طرح رنگوں سے ترتیب دیتا ہے کہ اس سے مماثلت قائم ہو اور لوگ اسے دیکھ کر ہرن کو پہچان سکیں اس صورت میں فن اگر نقل محض نہیں ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح شاعر واقعۂ کربلا کو بیان کرتا ہے، کربلا کے لق ودق میدان، وہاں کی تپش اور صعوبتوں کو نظم کرتا ہے تو اس صورت میں بھی وہ تخلیق نہیں کرتا بلکہ صرف ایک منظر جوں کا توں پیش کرتا ہے۔ تصویر محض عکس ہے، شاعری صرف نقل ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ فن کار جب ہرن کی تصویر بنائے یا شاعر کربلا کے میدان کی کیفیت نظم کرتا ہے تو کیا واقعی ہرن اور کربلا کے میدان کی ہو بہو نقل کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے؟ ذرا غور کیا جائے تو دراصل فن کار ہرن کے اس تصور کو پیش کرنا چاہتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے وہ صرف چند لکیروں ہی سے اس کے تصور کو واضح کر سکے۔ اس کی نقل سو فی صدی مطابق اصل نہیں ہوگی۔ جس سطح پر تصویر بنا رہا ہے وہ ضرور ہرن کے ایک حصے کو دیکھنے والوں کے سامنے پیش نہ کر سکے گی۔ اسی طرح کربلا کے میدان کا نقشہ صرف اس حیثیت سے ہی پیش کیا جاسکے گا جتنا الفاظ کی گرفت میں آسکتا ہے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے، آسمان کی کیفیت، وہاں کی بوباس، چمکتے ہوئے ریت کے ذرے اور نہ جانے کتنی جزئیات ہوں گی جو شاعر کو چھوڑ دینی پڑیں گی ان میں سے وہ صرف انہی پہلوؤں کو انتخاب کرے گا جنھیں وہ اپنا تصور کربلا پیش کرنے کے سلسلے میں معاون اور مفید خیال کرے گا۔ اس فن کار کی نقل بالکل مطابق اصل نہیں ہوگی بلکہ یقیناً اصل سے کچھ نہ کچھ کم ہوگی۔

لیکن یہ تصویر کا ایک ہی رخ ہے۔

اس طرح ہم نے یہ تو تسلیم کرلیا کہ فن کار کا مقصد خارجی شے کے اس تصور کی نقل کرنا ہوتا ہے جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے اور جو اس کی اپنی داخلی تخلیق ہے کہ یہ داخلی تصور محض تمثیلی یا سماوی نہیں ہوتا اور خارجی اشیا سے پیدا ہوتی ہے لیکن بلاشبہ یہ خارجی اشیا سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خارجی اشیا سے منفرد اور الگ وجود رکھتا ہے۔ لہٰذا فن کار دراصل خارجی اشیا کی نقل نہیں کرتا، ان سے

پیدا شدہ داخلی تصورات کی نقل کرتا ہے۔ وہ ہرن کی تصویر کھینچنا نہیں چاہتا، ہرن کے اس داخلی تصور کو پیش کرنا چاہتا ہے جو اس کے ذہن نے اخذ کیا ہے۔ کربلا کا میدان اس کا موضوع نہیں ہے کربلا کے میدان کا وہ تصور اس کا موضوع ہے جسے اس نے کربلا سے مختلف جزئیات کو تخیل اور تخلیقی عمل سے ترتیب دے کر اپنا داخلی تصور بنا لیا ہے۔ اس طرح فن کار مادی حقیقت کی نقل نہیں کرتا بلکہ اس تصور کی نقل کرتا ہے جو اس نے خارجی حقیقت سے قائم کیا ہے، وہ محض نقال نہیں ہے، خلاق ہے۔ اس کا کام تقلید نہیں، تخلیق ہے اور اس تخلیقی عمل کو افلاطون نے پوری طرح تسلیم نہیں کیا ہے۔

افلاطون نے اس داخلی عنصر کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر یہ داخلی عنصر نہ ہوتا تو یقیناً ایک منظر یا ایک خارجی شے کی تمام تر تصاویر ایک ہی جیسی ہوتیں ایک واقعہ کا بیان سارے تماشائیوں کی زبانی ایک ہی طرح سے ادا ہوتا۔ لیکن فن کی تاریخ شاہد ہے کہ ادنیٰ شے اور حقیر سے حقیر موضوع بھی مختلف فن کاروں کے قلم سے نکل کر بالکل مختلف اور منفرد ہو جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو بھی جو عام زندگی میں اسے ہزار بار دیکھ چکے ہیں اسے دیکھ کر تازگی اور جدت کا احساس ہوتا ہے فن کار مانوس اور قدیم حقیقت کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جو اس کے تخیل نے اخذ و ترمیم کے بعد بنائی ہے اور اس شے میں نئی حقیقت کا سراغ لگاتا ہے۔ ہمبولڈ کے الفاظ میں ''فن نقل نہیں ہے بلکہ تخیل کے ذریعے حقیقت کی نئی تشکیل ہے۔''

افلاطون دراصل ایک سچے مابعد الطبیعاتی فلسفی کی طرح تصور سے شے کی طرف رجوع کرتا ہے، مادے سے تصور تک نہیں پہنچتا۔ اس کے نزدیک زندگی ایک ماورائی تصور کو زمین پر بسا دینے اور مادے کی شکل میں بیدار کر دینے کی کوشش ہے اور اسی لیے ساری حقیقتیں تصوراتی ہیں۔ مادہ صرف اس کا معمولی اشاریہ ہے اور اسی عام فلسفیانہ میلان کی بنا پر فن کو بھی اس نے حقیقتِ تمام کو ناتمام مادی عکس کے روپ کے حصے کی شکل میں پیش کیا اور حقیقتِ نو کے اس عنصر کو فراموش کر دیا جو فن کار کی داخلیت شے کے وجود کو بخشتی ہے۔

افلاطون کے مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر، اخلاقی، مذہبی اور تصوراتی میلان اور عقل و فلسفہ سے غیر معمولی شغف کے باوجود اس خدمت کا انکار ممکن نہیں کہ اس نے آرٹ کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر سنجیدہ فکر کے دروازے کھول دیے۔ آرٹ کی ماہیت کا سوال اٹھایا اور ''نقل کی نقل'' کہہ کر اس کی صحیح تعریف کا مطالبہ کیا ہی نہیں بلکہ اس بہانے فن کے مختلف شعبوں میں فلسفیانہ ربط و آہنگ کی پہلی بنیاد قائم کی اور فن اور سماج کے باہمی رشتوں کی وضاحت کی۔ گو وہ اپنی ''جمہوریہ'' میں شاعری کے لیے جگہ نہ نکال سکا لیکن اس کی توجیہات نے نقدِ فن کے ہر میدان میں نئی دنیا میں آباد کرنے میں بڑی مدد دی۔

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔

پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415

قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

تبدیلی کے عمل کو قبول کرنے اور سمجھنے کی ضرورت

● نئی دہلی۔23اگست، اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 2روزہ سیمینار بعنوان ''اردو ادب کی تخلیقی جہات پر بیسویں صدی کی تحریکات اور نظریات کا اثر'' کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اور نظامت انیس اعظمی نے کی۔ افتتاحی جلسے میں پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ یہ دور صرف بیسویں صدی کا ہی نہیں بلکہ بیسیوں صدیوں کا بار اٹھائے کھڑا ہے اور لڑکھڑا رہا ہے۔ بیسویں صدی میں کئی تحریکیں ابھریں اور انتشار یا بے اطمینانی کے سبب ڈوب گئیں۔ ان میں ادبی تحریکیں بھی شامل تھیں۔ مستقبل صرف انہی کا ہوتا ہے جو حال کی للکار کو ماضی کے پورے شعور کے ساتھ قبول کرنے کی ہمت اور جرأت رکھتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے کہا کہ جب تک ایشو نہیں ہوں گے تب تک بڑا ادب پیدا نہیں ہوگا۔ معروف افسانہ نگار دیویندر اسر نے کہا کہ نظریات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ جو تبدیلی ہمارے نظریے اور اعتقاد کے خلاف ہوتی ہے اسے ہم رد کردیتے ہیں جبکہ ہمیں اپنی سمجھ میں تبدیلی لانی چاہیے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کہا کہ ترقی پسندوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ حرف آخر پیش کررہے ہیں۔ وہ ہمیشہ تبدیلیوں کو قبول کرتے ہیں اور ان کی یہی طاقت انھیں زندہ رکھے گی۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے کہا کہ یہ کہنا بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ مارکسزم کا زوال ہوگیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرمایہ داری تیسری دنیا میں اپنے پنجے گاڑ رہی ہے اور صارفیت حاوی ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر انیس اشفاق نے کہا کہ ہم مغرب کی طرف بھاگ رہے ہیں جبکہ ہمیں مشرق کی جانب بھی دیکھنا چاہیے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی نے کہا کہ ادبی اور فنی تحریکیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتیں اور ان کا آپس میں تعلق ہوتا ہے۔ تحریکیں مغرب کی ہوں یا مشرق کی سب نے ادب پر اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع نہیں مانتی بلکہ میرا ماننا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہمیں مجموعی طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ 20ویں صدی کا تخلیقی عمل دوسری صدیوں کے تخلیقی عمل سے کس طرح مختلف ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ صدی وہ ہے جو پچھلے تمام مفروضات توڑ چکی ہے۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اس سیمینار کے عنوان کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس مذاکرے کا مقصد ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے جن پر آج تک غور نہیں ہوا۔ سکریٹری اکادمی مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔

اس موقع پر پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر شافع قدوائی، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر ابن کنول، زبیر رضوی، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر قدوس جاوید، پروفیسر محمد شاہد حسن، ڈاکٹر خالد اشرف، رتن سنگھ اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی وغیرہ بھی موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تحقیق کے گرتے معیار کے لیے اساتذہ ذمے دار

● نئی دہلی۔ 23اگست، ریسرچ اسکالرز کی تعلیم وتربیت میں اساتذہ کا اہم کردار ہوتا ہے اس لیے اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ پوری سنجیدگی سے ان کی تربیت کریں۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اساتذہ اپنی ذمے داریوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اگر آج تحقیق کا معیار گرتا جارہا ہے اور اچھی ریسرچ نہیں ہو پارہی ہے تو اس کے لیے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی ذمے دار ہیں۔ ان خیالات کا اظہار آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی نے کیا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سیمینار میں بطور مہمان خصوصی افتتاحی تقریر کررہے تھے۔ قبل ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے آئے ہوئے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے سیمینار کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ تحقیق کے تئیں اب یہ رجحان ہوچکا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ملازمت یا پرموشن کے لیے تحقیقی کام ہوتے ہیں یا کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن اگر کوئی اس لیے ریسرچ کی جانب راغب ہوتا ہے تو ظاہر ہے اس کے کام کا معیاری ہونا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اب تحقیق کا معیار وہ نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کے درمیان ہی کچھ اسکالر ایسے ہوتے ہیں جو تحقیق کے بعد دیگر سرگرمیوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریسرچ اسکالروں پر اور ان کے تحقیقی کام پر ہمیں پوری سنجیدگی سے توجہ دینی ہوگی اور اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج تحقیق کا معیار گررہا ہے۔ اس کے بعد کے

تین اجلاس میں پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر مہدی اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی جبکہ ریسرچ اسکالر زمرد مغل، عباد احمد، نور فاطمہ اور مصطفی علی بیگ نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی اور پروفیسر شمس الحق عثمانی اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی جبکہ ریسرچ اسکالر محمد خالد، احسن حسن اور سلمیٰ بانو فخرالدین نے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ریحانہ خاتون اور ڈاکٹر مظہر مہدی نے کی جبکہ ریسرچ اسکالر خالد مبشر، فضل الرحمٰن تمنا، ذوالنورین اور فوزیہ وحید نے مقالے پیش کیے۔ ان اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر شعیب رضا خاں اور ممتاز عالم نے انجام دیے۔ سیمینار میں اساتذہ پر سخت تنقید کی گئی کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے دور ہو رہے ہیں اور شعبے کی سیاست میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح کی گفتگو سے سیمینار میں تھوڑی حرارت بھی پیدا ہوئی اور کچھ حقیقتیں بھی منظر عام پر آئیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو تعلیمی کمیٹی کے وفد کی سونیا گاندھی سے ملاقات

● نئی دہلی۔ 29 اگست، کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے سہ روزہ اجلاس کے نمائندہ مندوبین کے ایک وفد نے محمد جلیل پاشا کی قیادت میں آج کل ہند کانگریس کمیٹی کی صدر مسز سونیا گاندھی اور راہل گاندھی سے ملاقات کی اور طے شدہ قراردادوں پر مشتمل میمورنڈم پیش کیا۔ گزشتہ روز جلیل پاشا کی قیادت میں اس وفد نے ارجن سنگھ، اے آر انتولے، شیلا دکشت اور گرجا ویاس کو میمورنڈم پیش کیے تھے۔ سونیا گاندھی اور راہل گاندھی سے جلیل پاشا نے ملک کے 80 کروڑ اردو بولنے والوں کے لیے اردو کے بارے میں ایک قومی پالیسی وضع کیے جانے کی درخواست کی اور مرکزی حکومت کے ذریعے مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو قومی یوم تعلیم قرار دیے جانے کے اعلان پر شکریہ ادا کیا۔ جلیل پاشا نے آئندہ 11 نومبر کو پونہ میں بڑے پیمانے پر منعقد ہونے والے جشن اردو میں شرکت کی دعوت دی جس کو انھوں نے قبول کرلیا۔ ملاقات کرنے والے وفد میں پروفیسر محمد اقبال، ماسٹر کوثر خان، عقیل احمد بھاول، پروفیسر فیضہ قمر لکھنؤ پروفیسر صادقہ ذکی دہلی، ڈاکٹر محمد خالد، قاسم زبیری، ارشد احمد ایم کے حسنین انصاری ناگپوری، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، شائستہ انصاری، طالب انصاری اور مختار صدیقی شامل تھے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

جاپان میں فیض، غالب سے زیادہ مقبول

● نئی دہلی۔ 30 اگست، جاپان میں غالب کو کوئی نہیں جانتا، ان کی شاعری میں اتنی پیچیدگی ہے کہ غالب کو سمجھنے میں جاپانیوں کو 5 سے 10 سال لگیں گے۔ غالب کو جاپان کے اہل دانش صرف مغلیہ عہد کے ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مگر ان کی مکمل شخصیت سے واقف نہیں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مشہور جاپانی اسکالر پروفیسر ہیروجی کتاؤ نے اپنے توسیعی خطبے میں کیا۔ یہ توسیعی خطبہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا ''غالب اور جاپان'' کے موضوع پر توسیعی خطبے میں پروفیسر ہیروجی کتاؤ نے مزید کہا کہ غالب کے مقابلے میں فیض احمد فیض سے لوگ زیادہ واقف ہیں اور ان کی شاعری سے متاثر بھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب اور فیض میں فرق یہ ہے کہ غالب مشکل پسند شاعر ہیں، جب کہ فیض کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ کتاؤ نے کہا کہ انھوں نے ''دیوان غالب کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے مگر اس دیوان پہ نہ کوئی تنقید ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی تبصرہ آیا ہے، انھوں نے دیوان غالب کے جاپانی ترجمے میں اصل متن سے قبل، غالب کی سوانح، اس عہد کا عام ادبی ماحول اور اردو کی غزلیہ شاعری اور اس کی روایت، اس زمانے کے سماجی اور ثقافتی حالات کا بھی ذکر کیا ہے تاکہ جاپانی قاری کو غالب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ غالب کی شاعری کے حوالے سے انھوں نے اپنے مضمون میں بہت سی باتیں کہیں اور ترجمے کی دقتوں کے بارے میں بھی بتایا کہ جاپانی میں غالب کا ترجمہ کرنے میں انھیں بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ غالب کو میں نے منظوم ترجمہ کیا ہے مگر قافیہ اور ردیف کا التزام جاپانی میں ممکن نہیں اس لیے میں نے جاپانی شعری صنف کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے جاپانی میں فیض احمد فیض اور سعادت حسن منٹو کے ترجمے بھی کیے ہیں اور اس کی وجہ سے جاپان، جنوبی ایشیا میں اردو ادب کے تعلق سے تھوڑی بیداری آئی ہے اور لوگ یہاں کی ادبی تخلیقات کے حوالے سے برصغیر کے سیاسی و سماجی احوال و کوائف کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ استقبالیہ و تعارفی کلمات میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ موصوف جاپان میں ٹوکیو یونیورسٹی کے بین الاقوامی فیکلٹی میں ہیں اور جنوبی ایشیا کی تہذیب و ثقافت ان کے مطالعے کا خاص موضوع ہے، غالب اور فیض پر ان کا کام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ صدارتی خطاب میں مجیب رضوی نے کہا کہ غالب کی روحانی دنیا بہت وسیع ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے اشعار کو پڑھنا اور سمجھنا ایک نئے احساس کی بالیدگی کا سبب بنتا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

9 نومبر کو عالمی یوم اردو منانے کا اعلان

● نئی دہلی۔ 11 اگست، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک میٹنگ ڈاکٹر مولانا ایم رضوان اختر قاسمی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں

بزرگوں کی قابل قدر یادگار ہیں۔

سیمینار اور جشن اجرا کی نظامت کرتے ہوئے روزنامہ "پندار" کے سابق چیف ایڈیٹر ڈاکٹر سید ریحان غنی نے کہا کہ خانقاہیں صرف رشد و ہدایت کا مرکز ہی نہیں بلکہ علم و ادب کا گہوارہ بھی ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والے بزرگوں اور صوفیوں نے جہاں ایک طرف ہدایت کی شمعیں روشن کیں وہیں علم و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا، ان میں بہار کی خانقاہیں بھی شامل ہیں جن میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

"تذکرہ نگاری میں خانقاہوں کی خدمات" کے مرکزی موضوع پر منعقد کیے گئے قومی سیمینار میں جن فاضل مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر محمد حسن رامپور (یوپی) نے بعنوان "مشائخ کے تذکروں کی اہمیت و افادیت" مولانا سید نور الہدیٰ شمسی (پٹنہ) نے بعنوان "محی الملۃ ۔ خانقاہ مجیبیہ کا ایک اہم تذکرہ"۔ ڈاکٹر سید شاہ فتح اللہ قادری (پھلواری شریف) نے بعنوان "مشائخ بہار کے مطبوعہ تذکرے" (بہ لحاظ سال اشاعت)۔ ڈاکٹر رضوان اللہ (آرہ) نے بعنوان "تذکرہ نگاری میں خانقاہ مجیبیہ کی روایت۔ ایک اجمالی جائزہ"۔ ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری (دہلی) نے بعنوان "تذکرہ نگاری میں اہل تصوف کی خدمات"۔ سید شاہ متین الحق عمادی (پٹنہ) نے بعنوان "خانقاہ عمادیہ کے تذکرہ نگار سجادگان"۔ مولانا سید شاہ بدر احمد مجیبی (پھلواری شریف) نے بعنوان "مشائخ بہار کے مطبوعہ تذکرے" (بہ لحاظ سال اشاعت)۔ ڈاکٹر رضوان اللہ (آرہ) نے بعنوان "تذکرہ نگاری میں خانقاہ مجیبیہ کی روایت۔ ایک اجمالی جائزہ"۔ ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری (دہلی) نے بعنوان "تذکرہ نگاری میں اہل تصوف کی خدمات"۔ سید شاہ متین الحق عمادی (پٹنہ) نے بعنوان "خانقاہ عمادیہ کے تذکرہ نگار سجادگان"۔ مولانا سید شاہ بدر احمد مجیبی (پھلواری شریف) نے بعنوان "بزرگان پھلواری شریف کا ایک اہم تذکرہ۔ آثارات پھلواری شریف"۔ ڈاکٹر سید اسد علی خورشید (علی گڑھ) نے بعنوان "تذکرۃ الکرام کے مؤلف۔ حیات و خدمات" اور پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق (داناپور) نے بعنوان "تذکرۃ الکرام فارسی کی خصوصیات" پر مقالے پیش کیے۔ "مشائخ کے تذکروں کی اہمیت و افادیت" کے موضوع پر مولانا سید شاہ سیف الدین فردوسی (بہار شریف) نے مجمع عام کو خطاب فرمایا۔

آخر میں سید شاہ محمد آیت اللہ قادری زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ تصوف خالص اسلامی چیز ہے اور صوفیہ کے تذکروں سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ تصوف بعد کے زمانے کی کوئی ایجاد نہیں ہے بلکہ براہ راست سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے اور صوفیہ کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مربوط ہے۔ تصوف کے بارے میں بعض نافہموں نے جو پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ تصوف دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہے اور اس کو صوفیہ نے عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں سے لیا ہے یہ سراسر غلط ہے بلکہ تصوف خالص اسلامی چیز ہے اس کو قرآن و حدیث اور اخیار امت سے اخذ کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث نے جس کو تزکیے و احسان سے تعبیر کیا ہے اسی کو بعد میں تصوف و سلوک کہا گیا ہے۔

سیمینار اور اجرا کی تقریب کا اختتام زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ کی دعا پر ہوا۔

"تذکرہ نگاری میں خانقاہوں کی خدمات" کے موضوع پر یہ اپنی نوعیت کا منفرد سیمینار تھا جو مشرقی ہندوستان کی علمی، دینی و روحانی اور قومی و ملی اتحاد کے لحاظ سے مابہ الامتیاز خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ میں بحسن و خوبی تکمیل کو پہنچا۔

(ڈاک سے)

اردو اور ہندی ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ

● اردو اور ہندی ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ ہیں اور دونوں زبانوں کی ترقی سے ہی ہندوستان کی ترقی ممکن ہے۔ جب تک ہم اپنی زبان کو مستحکم نہ کریں گے ہماری تہذیب بھی مستحکم نہ ہوگی۔ بزم جگر مشرقی چمپارن نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل تحسین اور قابل تقلید ہے۔ یہ باتیں چکیا سب ڈویژنل افسر مسٹر کمیشور پرساد نے بزم جگر کے زیر اہتمام مفت اردو ہندی کوچنگ سینٹر کے افتتاح کے بعد کہیں۔ واضح رہے کہ میٹرک کے طلبہ و طالبات کے لیے بزم جگر نے مفت اردو ہندی کوچنگ کا اہتمام کیا ہے جس میں دو سو طلبہ و طالبات کا داخلہ ہو چکا ہے۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈی۔ایس۔ پی چکیا مسٹر بی پی رجک نے کہا کہ محنت اور لگن سے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ اس سنٹر میں داخلہ لینے والے اسٹوڈنٹس پوری محنت اور ایمانداری سے اپنے فرائض کو انجام دیں گے۔

اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کے کمتر طبقے اور تھاروؤں کی زندگی میں نئی روح پھونکنے والے اور بھوجپوری ادب اور ہندی ساہتیہ کے لیے ملکی پیمانہ پر شناخت رکھنے والے پرساد رتنیشور کو "ادب اور رنگ کرم" کے میدان میں نمایاں کام کے لیے جگر مہسوی ایوارڈ 2008 سے سرفراز کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایوارڈ میرے لیے بہت ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا تعلق اس شاعر سے ہے جن کے اشعار کو پڑھ کر ہندوستان کے سابق وزیر اعظم چندر شیکھر نے اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا۔

ہندی اور بھوجپوری ادب پر دسترس رکھنے والے شاعر و صحافی جناب یوگیندر ناتھ شرما کو بھی مذکورہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پرساد رتنیشور کو ایس ڈی۔ او چکیا نے ٹرافی اور توصیف نامہ عطا کیا جبکہ یوگیندر ناتھ شرما کو ڈی ایس۔ پی چکیا نے مہمانوں کا استقبال راما شنکر سنگھ اور ستیہ دیو رائے آریہ نے کیا۔ مولانا

عبدالستار رحمانی نے اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ ادب ہی انسان کو اشرف بناتا ہے اور دیگر ذی روح جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ہمیں اگر صالح معاشرے کی تعمیر کرنی ہے تو صالح ادب کو فروغ دینا ہوگا۔ پروگرام کی نظامت ہندی اور اردو کے شاعر جناب لکشمن احساس نے کی اور بزم جگر کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ قابل ذکر ہے کہ لکشمن احساس کی خصوصی دل چسپیوں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

بزم جگر کے صدر ڈاکٹر حاتم جاوید نے اپنے خطاب میں کہا کہ میٹرک کے رزلٹ میں اردو اور ہندی میں کم نمبر آنے سے بہت سارے لڑکوں اور لڑکیوں کا ڈویژن ادھر ادھر ہوگیا اور بہت سے ناکامی سے دوچار ہوئے جس کے بعد میں نے اس مفت کوچنگ سنٹر کے آغاز کا فیصلہ کیا جو آج حقیقی شکل میں سامنے ہے۔ ڈاکٹر جاوید نے اردو سنٹر میں داخلہ لینے والے طلبہ و طالبات کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ (ڈاک سے)

مظہر امام کی ادبی خدمات پر ایک روزہ سیمینار

● 27 جولائی 2008 بروز اتوار ''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں ساہتیہ اکادمی دہلی کے اشتراک سے مشہور و معروف شاعر و ناقد جناب مظہر امام کی ادبی خدمات پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے اجلاس کے آغاز میں خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سیمینار کے لیے ساہتیہ اکادمی کے اشتراک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مظہر امام کی جانفشانی کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شہر یار نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عنبر بہرائچی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے مظہر امام کی نظم نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مظہر امام کی نظمیں اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے مظہر امام کے ان مضامین کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جو انھوں نے فکشن پر لکھے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مظہر امام کو اولین اصناف اور ان کے مصنفین کو دریافت کرنے میں خاصی دلچسپی ہے۔ ان کی تنقید دراصل تحقیقی تنقید ہوتی ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد صدارت و نظامت کے فرائض پروفیسر وہاب اشرفی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے مظہر امام کی شاعری کا مطالعہ ان کے معاصرین کی شاعری کو سامنے رکھ کر پیش کیا۔ جناب قاسم خورشید نے اپنے مقالے میں مظہر امام کی شاعری کے استعاروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مظہر امام نے اردو شاعری کو بہت سے نئے استعارے عطا کیے ہیں۔

ظہرانے کے بعد دوسرا اجلاس مشہور افسانہ نگار جناب عابد سہیل کی صدارت میں شروع ہوا۔ جناب مشتاق احمد نوری نے اپنے مقالے میں مظہر امام کے خاکوں کی کتاب ''اکثر یاد آتے ہیں'' پر ناقدین کے تبصروں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کو پڑھ کر ناقدین نے متضاد آرا پیش کیں۔ کسی نے ان کو ''خاکے'' کہا تو کسی نے ''یادنگاری'' ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی (علی گڑھ) نے مظہر امام کی ادبی خدمات پر ایک سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ بحث و مباحثہ کے دوران میں پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ دراصل تخلیقات میں مصنف کی شخصیت سے گریز کا رجحان پایا جاتا ہے لیکن مظہر امام کے یہاں اس کے برعکس ان کی شخصیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جناب حسین الحق نے اپنے مقالے میں ذاتی یادداشتوں کے حوالے سے مظہر امام کی شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں اجلاس کے صدر جناب عابد سہیل کے بھی مظہر امام کی ایجاد کردہ ''آزاد غزل'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مظہر امام نے ''آزاد غزل'' محض 16 سال کی عمر میں لکھنا شروع کردی تھی لیکن ان غزلوں کو شائع کرانے کی نوبت 1960 کے بعد پیش آئی۔

دونوں اجلاس کے اختتام پر شام 5 بجے ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شہر یار اور نظامت عنبر بہرائچی نے کی۔ جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔ جمال اویسی، خورشید اکبر، عالم خورشید، بھگوان داس، اعجاز، شان بھارتی، فرحت احساس، سلطان اختر، عنبر بہرائچی اور پروفیسر شہریار۔ (ڈاک سے)

پہلی برسی پر قرۃ العین حیدر کو خراج عقیدت

● مرادآباد۔ 22 اگست، قرۃ العین حیدر کی پہلی برسی پر ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک ادبی مجلس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت شکیل انور صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض سید آصف حسین نے ادا کیے مہمان خصوصی محترمہ قمر قدیر ارم صاحبہ اور قاسم مرادآبادی صاحب کے علاوہ اویس شمسی، ملک فروزالدین، معظم علی، ناصرہ کریم اشعر شمسی، مرزا مختر بیگ وغیرہ نے مرحومہ کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ عبدالمجید شمسی صاحب نے مرحومہ سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قرۃ العین حیدر کی پیدائش ضلع بجنور کے شہر نہٹور میں ہوئی ان کی والدہ کا تعلق شہر جگر مرادآباد سے تھا وہ دو مرتبہ مرادآباد تشریف لائیں۔ ان کے ایک عزیز بہاء الدین نواب پورہ میں اور حسین مہدی رضوی صاحب لاکڑی والان میں رہتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی جائداد آج بھی گورنمنٹ کالج کے قریب موجود ہے۔ ان کی کئی کہانیوں میں لاکڑی والان اور مغلپورہ کا ذکر بھی موجود ہے ان کا ننھیال سری محمود پور میں ہے۔ عبدالمجید شمسی صاحب نے قرۃ العین حیدر کی

یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ میرا اور ان کا تعلق ایک بھائی بہن جیسا تھا وہ ممبئی میں آشا اپارٹمنٹ کے فلیٹ میں رہتی تھیں تو اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا۔ اکثر مجھے اردو کتابوں کا تحفہ دیا کرتی تھیں۔ میں بھی مراد آباد سے پیتل کے برتن، باسمتی چاول اور مٹھائی لے کر جاتا تو اس پر مجھے ڈانٹ دیا کرتی تھیں وہ کہتی تھیں یہ تکلف مت کیا کرو۔ میری ان سے خط و کتابت بھی رہی۔ ان کے ارسال کردہ خط میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ (صحافت، دہلی)

● چنڈی گڑھ۔ 12 اگست، ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے آر قدوائی نے کہا ہے کہ صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی اور انگریزی جیسی دوسری زبانوں کے ادیب اور شاعر بھی سماج کو نئی سمت دینے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر قدوائی آج یہاں ہریانہ اکادمی کے زیر اہتمام قرۃ العین حیدر پر منعقدہ دو روزہ کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہر زبان کے ادیب کا نصب العین ایک ہی ہوتا ہے وہ ملک کی تعمیر اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کی اصلاح کے جذبے سے اپنا ادب تخلیق کرتا ہے۔ وہ دیگر زبانوں کے ادیبوں کی ادبی تخلیقات، فکر اور تجربات سے بھی استفادہ کیا کرتا ہے۔ انھوں نے ہریانہ اردو اکادمی کو ریاست میں اردو زبان کے فروغ و ترویج اور تحفظ کے لیے کی جانے والی کوششوں کے لیے مبارکباد دی۔ اس تقریب میں پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ محترمہ حیدر نے اپنے ناولوں اور کہانیوں جیسے دلربا، ستاروں سے آگے، چائے باغان، چاندنی بیگم، آگ کا دریا وغیرہ کی وساطت سے اردو ادب کو مقبول کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری کشمیری لال ذاکر نے کہا کہ یہ سیمینار مرحوم قرۃ العین حیدر کی برسی پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقدہ کیا گیا ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

[illegible]

● آگرہ۔ 21 اگست، ہمارے جتنے مسائل ہیں، چاہے ان کا تعلق روزگار اور کاروبار سے ہو یا سیاست سے، مذہب سے ہو یا تہذیب اور اخلاق سے، ہر مسئلے کا حل معقول تعلیم ہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایک پروگرام میں مسلم دانشوروں نے کیا۔ یہ پروگرام آگرہ کی ادبی وثقافتی تنظیم "انجمن ہماری تہذیب" کے یوتھ ہاسٹل میں ہوا۔ اجلاس میں ادبی خدمات کے لیے اسرار اکبرآبادی کو ایوارڈ دیا گیا۔ ان کا تعارف اور تہنیت نامہ داؤد اقبال ایڈووکیٹ نے پیش کیا۔ اس کے بعد ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں اردو مضمون کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات اور سرٹیفکیٹ پیش کیے گئے۔

ہائی اسکول میں اردو مضمون میں ٹاپ کرنے والی صغیر فاطمہ گرلز انٹر کالج کی طالبہ بے بی گلفشاں اور انٹر میں اسی کالج کی ٹاپر نازیہ ام کلثوم کو ٹاپر کی ٹرافی بھی دی گئی۔ ایس این میڈیکل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر غیاث الدین قریشی، سینٹ جانس ڈگری کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شفیق اشرفی اور سہیل قریشی کونسلر گر گم نے تعلیم اور ادب کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا۔ اسرار اکبرآبادی نے آگرہ کی ادبی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ بانی ومنتظم لئیق احمد لئیق نے "انجمن ہماری تہذیب" کی تاریخ اور اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اختیار جعفری اور احمر جلیسری نے انجام دیے۔ فرقانہ بیگم اور جگدیش پرساد ماہیشوری نے تقاریر کیں۔ اس کے بعد ایک شعری نشست ہوئی جس میں زاہد لطفی، انجم اکبرآبادی، ظہیر اکبرآبادی، رئیس اکبرآبادی، لئیق اکبرآبادی، داؤد اقبال، ڈاکٹر سرور مارہروی، احمر جلیسری اور اسرار اکبرآبادی نے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ صدارت حاجی جمیل الدین قریشی نے کی۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● امروہہ۔ 11 اگست، پنجاب سرکار کی جانب سے سالانہ دیا جانے والا ادبی ایوارڈ اس سال ڈاکٹر ناشر نقوی کو دیا گیا۔ جس سے خوش ہوکر ان کے آبائی وطن امروہہ میں بزم حیات کی جانب سے دارالعلوم سید المدارس میں ایک اعزازی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت مولانا ڈاکٹر سید محمد سیادت نے کی۔ ڈاکٹر شفاعت فہیم نے ان کا مفصل تعارف کرایا۔ شمیم امروہوی نے موصوف کو تہنیت نامہ پیش کیا۔ تلاوت کلام پاک سے حافظ شمیم امروہوی و نعت پاک سے مولانا سعد امروہوی نے آغاز کیا۔ ڈاکٹر جمشید کمال، ڈاکٹر مولانا شہوار حسین اور ڈاکٹر مولانا احسن اختر نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر ناشر نقوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج جو مجھے یہ مقام حاصل ہوا ہے یہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے اساتذہ مولانا سید محمد سیادت حسن عباس کاظمی اور مرزا ساجد حسین کا عطیہ ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ بزم حیات کے صدر اخلاق حیدر، ندیم دلشاد نگینوی، نائب صدر، جنرل سکریٹری قائم حسین ایڈووکیٹ نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جمشید کمال نے انجام دیے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

متفرقات

● برطانیہ کے اردو لکھاری مقصود الٰہی کو پاکستان کے یوم آزادی 14 اگست 2008 پر ان کی نمایاں ادبی خدمات کے لیے صدارتی تمغۂ امتیاز کا اعلان کیا گیا ہے۔ پاکستان سے باہر کسی اردو لکھاری کو ملنے والا یہ پہلا بڑا اعزاز ہے۔ بریڈفورڈ میں رہنے والے مقصود الٰہی شیخ نارتھ انگلینڈ کے واحد ایشیائی اخبار ومیگزین راوی کے پچیس سال سے زائد ایڈیٹر رہے۔ ان کو بریڈفورڈ

میں سب سے پہلا پاکستانی جسٹس آف پیس ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اب وہ پہلے قلمکار ہیں جن کی ملک سے باہر رہتے ہوئے نمایاں خدمات کا حکومتی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین افتخار عارف نے ان کو اکامی اور ملک بھر کے اہل قلم کی جانب سے مبارکباد دی ہے۔

(ڈاک سے)

● مورخہ 27 جولائی کو اعظم ٹرسٹ کے زیر اہتمام ضلع پونے کے 29 اردو مدارس اور اقلیتی کالج سے اعزازی نمبروں سے کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کی پذیرائی کے لیے ایک جلسۂ تہنیت کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر امتیازی طلبہ کو سالانہ ایک ہزار روپئے کی اسکالرشپ بھی دی جاتی ہے جو ان کے تعلیم مکمل کرنے تک جاری رہتی ہے۔ اس اسکیم کے ذریعے اردو کی اہمیت کو واضح کیا جاتا ہے اور یہ مثبت پیغام دیا جاتا ہے کہ آگے بڑھنے والے ہر حال میں آگے بڑھتے ہیں۔ زبان ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اپنی استقبالیہ تقریر میں منور پیر بھائی (چیئرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ) نے پونے کے اردو اسکولوں کا مکمل تجزیہ پیش کیا۔ ممتاز پیر بھائی صدر (بزم خواتین پونے) نے مہمان خصوصی ڈاکٹر وسیم الرحمٰن کا تعارف پیش کیا۔ مہمان خصوصی کے ہاتھوں سالانہ مجلّہ امتیاز کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ کامیاب بچوں نے اپنے تاثرات پیش کیے اور پھر مہمان خصوصی جناب وسیم الرحمٰن حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ انھوں نے اپنے علمی سفر اور آئی اے ایس کی تیاریوں، اپنی ناکامیوں اور جہد مسلسل کی مکمل روداد پیش کی اور کہا کہ جس طرح بہاؤ کی مخالفت میں تیرنے کے لیے قوتِ عمل اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نامساعد حالات میں آگے بڑھنے اور کامیابی کے لیے محنت، حوصلہ اور ایمانداری درکار ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کو رکاوٹ ماننے والے افراد کے لیے مظہرالحق اور راس ناچیز کی مثال سامنے ہے کہ ہم نے اردو کے ذریعے اس منزل کو حاصل کیا ہے۔ اس موقع پر ایم سی ای کی نائب صدر عابدہ انعامدار اور صدر پی اے انعامدار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تعلیم جدید کے تقاضوں اور قوم کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے پر زور دیا۔ بعد ازاں تقسیم انعامات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ڈسٹنکشن ہولڈر، ہر مضمون میں سرفہرست، ہر اسکول کے سرفہرست، نیز اقلیتی کالجوں سے ایچ ایس سی اور پھر پونے کے 29 اردو مدارس میں سرفہرست طلبہ و طالبات کے لیے انعامات اور اسکالرشپ مہمان خصوصی اور دیگر معززین کے ہاتھوں عطا کیے گئے۔ اس کے علاوہ متعلقہ اساتذہ کی بھی پذیرائی کی گئی ایس ایم خان کے رسم شکریہ پر اس جلسے کا اختتام ہوا۔ نظامت کی ذمے داری ظل ہما بار گیر اور بیناز مودی نے بخوبی نبھائی۔

● نئی دہلی۔ 16 اگست، اردو کے معروف فکشن رائٹر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر غضنفر علی کے استقبال میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ حالیہ دنوں میں ڈاکٹر غضنفر علی کا جامعہ اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا ہے۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر اختر الواسع اور نظامت ڈاکٹر مولا بخش کنوینر اردو سوسائٹی نے کی۔ اس پروگرام میں موجود پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر انور پاشا، انجم، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر نصیر احمد، ابرار کرتپوری، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر ناظمہ جبیں، محترمہ بشریٰ، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر ابوالکلام عارف، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، اسرار جامعی، حاجی ادریس انصاری، زینت پروین اور شاہد اقبال کے ساتھ سامعین نے بھی غضنفر علی کو مبارک باد پیش کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر غضنفر نے اپنی کہانی ''تصویر تخت سلیمانی'' پیش کی۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جامعہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر کے لیے ڈاکٹر غضنفر سے بہتر نام ہمارے پاس نہیں تھا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ کہانی کا مرکزی کردار معمر شخص آج کی دنیا کا سیاسی رہنما ہے۔ ڈاکٹر انور پاشا نے فکشن کی تنقید کو ایک نیا طریق کار قرار دیا۔ ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر شہزاد انجم، نگار عظیم، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر ابوالکلام عارف، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی اور ڈاکٹر مشتاق صدف نے بھی کہانی کی رمزیت پر گفتگو کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر غضنفر نے کہا کہ انھیں جو عہدہ پیش کیا گیا ہے وہ پوری ایمانداری سے نبھائیں گے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

●13 اگست۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں رفتار ادبی فورم کے تحت ایک ادبی تقریب ''ایک شام منور رانا کے نام'' منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر انوار عالم پاشا نے کی اور مہمانِ خصوصی بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر نسیم احمد تھے۔ تقریب میں خواجہ محمد اکرام الدین ''رفتار ادبی فورم'' کے سرپرست کی حیثیت سے موجود تھے۔ فورم کے سابق صدر ڈاکٹر شکیل احمد خاں بھی شریک بزم تھے۔ نظامت کے فرائض فورم کے صدر ڈاکٹر محمد زاہد الحق نے انجام دیے۔

جے این یو کی شام جو عشائیہ کے بعد شروع ہوتی ہے نصف شب تک سامعین کی داد و تحسین سے منور رہی۔ خاص طور پر ان اشعار پر بہت داد ملی:

بادشاہوں کو سکھایا ہے قلندر ہونا
آپ آسان سمجھتے ہیں منور ہونا
تمھاری آنکھوں کی توہین ہے ذرا سوچو
تمھارا چاہنے والا شراب پیتا ہے
بچھڑتے وقت بہت مطمئن تھے ہم دونوں
کسی نے مڑ کے کسی کی طرف نہیں دیکھا

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے رفتار ادبی فورم کی گزشتہ کارروائیوں کا

خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر نسیم احمد نے طلبہ کی تنظیم کی طرف سے اتنے بڑے جلسے کا اہتمام دیکھ کر اسے سراہا اور اسے خوش آئند مستقبل کا پیش خیمہ قرار دیا۔ ڈاکٹر شکیل احمد خاں نے اپنی جے این یو کی زندگی کے تجربات کے حوالے سے ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کی افہام وتفہیم میں اس قسم کے اجتماع کو ایک بہترین وسیلہ قرار دیا۔ ڈاکٹر انور پاشا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ جے این یو میں کسی شاعر کے نام ایک شام معنون کرنے کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔ اب سے پہلے صرف فیض احمد فیض کے اعزاز میں 1984 میں یہاں ایک شام منائی گئی تھی۔

(ڈاک سے)

● اعظم ایجوکیشن سوسائٹی اور غریب نواز فورم کی جانب سے دو روزہ تعلیمی اعزازی تقریب منائی گئی پہلا پروگرام اعظم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوا جس کی صدارت جسٹس ایم ایس اے صدیقی (نئی دہلی) نے فرمائی جناب معین الدین فاروقی جناب محمود علی فاروقی ڈاکٹر محمد عیسیٰ نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ مذہبی اور سماجی خدمت کرنے والی شہر کی اہم شخصیات کو جسٹس صاحب کے ہاتھوں مومنٹو پیش کیا گیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد انیس میمن، ڈاکٹر ارجن پرشاد شرما، اکرم وقار صدیقی، محمد امین خان ایڈووکیٹ، پروفیسر کے پی پرمار، ڈاکٹر نرنجن ہریتوال (آیوروید) ڈاکٹر آر اے شرما، حافظ نذیر احمد اسی موقع سے چھتیس گڑھ بیت المال آرگنائزیشن کی طرف سے 15 طلبہ کو سالانہ اسکول فیس اور دو غریب مستورات کو سلائی مشین دی گئی۔

دوسرا پروگرام غریب نواز ایجوکیشن فورم کے زیر اہتمام 3 اگست صبح دس بجے رکھا گیا قاری عبدالسنان صاحب کی تلاوت سے پروگرام کی کارروائی شروع ہوئی اس کے بعد غریب نواز اسکول انگلش میڈیم کے طلبہ نے ڈاکٹر اقبال کا ترانہ ”لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری“ پڑھا۔ غریب نواز فورم کی جانب سے پورے چھتیس گڑھ صوبے میں بورڈ کے امتحانات میں ساٹھ فیصد سے اوپر نمبر حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔ ماسٹر جمن اور اقبال شریف نے اپنی مشترکہ نظامت سے پروگرام کی کامیابی میں اہم رول ادا کیا۔ اخیر میں مولانا سید علی احمد مصباحی سیوانی کے ہاتھوں ”بزم نقابت“ کی رسم اجرا عمل میں آئی جو مولانا سلیم الزماں نوری مظفر پوری نے ترتیب دی ہے۔ اردو میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم محمد شمس الدین کو پانچ ہزار روپیہ اور سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ (ڈاک سے)

● پٹنہ۔ بہار کی معروف ادبی تنظیم علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام مقامی اردو بھون میں بزرگ شاعر جناب شگفتہ سہسرامی کے تین شعری مجموعوں کا اجرا ہوا ڈاکٹر امجد رضا امجد کی تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ بعدازاں پروفیسر وہاب اشرفی، حضرت ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر شمیم الدین احمد منعمی اور ڈاکٹر منظر اعجاز کے ہاتھوں شگفتہ سہسرامی جنرل سکریٹری پرویز عالم نے اس موقع پر موجود سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اسٹیج پر موجود مہمانوں کو گلدستے پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ پہلے جلسے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر زین رامش نے انجام دیے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شگفتہ کی نظمیں ان کی غزلوں سے زیادہ اہم ہیں ان کی نظم ”شانتی“ اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے ان کی سب سے بہتر تخلیق ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے نظم ”شانتی“ میں فطری روانی کو سراہا، جناب حسن نواب نے موضوع سے اہم اسلوب کو بتاتے ہوئے شگفتہ کے یہاں اسلوب کی دلآویزی کی نشاندہی کی۔ جناب شان الرحمٰن نے شگفتہ کی نظموں اور غزلوں دونوں کو سراہا، شمیم الدین احمد نے یا صاحب الجمال (مجموعہ نعت) پر اظہار خیال کرتے ہوئے نعتیہ شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، مہمان خصوصی ناوک حمزہ پوری نے شگفتہ کی نعتوں میں خلوص اور عقیدت کا اعتراف کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر وہاب اشرفی نے شگفتہ کی شاعری اور فن نظم نگاری پر اظہار خیال کیا۔

دوسرا حصہ مشاعرہ کا تھا جس کی صدارت جناب ناوک حمزہ پوری نے کی اور نظامت ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دی۔ (ڈاک سے)

● گورکھپور۔ انجمن محبان اردو کی بارھویں ماہانہ نشست سید مشتاق احمد کی صدارت میں ہوئی۔ محمد پرویز صدیقی مہمان خصوصی تھے۔ نشست کا آغاز مولانا حافظ ابوالوفا خاں کی تلاوت کلام پاک اور راز اعظمی کی نعت خوانی کے بعد ہوا۔ اس نشست میں شرکا نے جواہر نوودے ودیالیہ میں اقلیتی طبقے کی شمولیت کے ساتھ تعداد طلبہ میں اضافہ کس طرح ہو اس پر گفتگو کی۔ جواہر نوودے ودیالیہ ایک ایسا تعلیمی مشن ہے جس سے ہر طبقے اور فرقے کو مرکزی حکومت کی جانب سے یکساں فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں سید نورالحسن، محمد یعقوب فاروقی، ڈاکٹر رضی الرحمٰن، محمد افراہیم، راز اعظمی، طفیل احمد، شمس الحق، معراج احمد انصاری اور نیاز احمد خاں شامل تھے۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

کچھ پہلوؤں کو میری نظر دیکھتی نہ تھی
دنیا بری تو تھی مگر اتنی بری نہ تھی

مخمور سعیدی

● نئی دہلی۔ 17 اگست، انجمن عروج ادب نے ایک طرف جہاں اپنی خدمات کے پچاس سال پورے کیے اور پچاس سالہ خدمات پر مشتمل ایک سوونیئر کا اجرا عمل میں آیا۔ وہیں اس موقع پر گولڈن جوبلی جشن آزادی مشاعرہ بھی منعقد کیا۔ بے شمار ادبی وثقافتی پروگراموں کے تاریخی مرکز ایوان

غالب میں منعقد اس شعری تقریب میں نامور شعرا نے شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ مشاعرے میں بحیثیت صدر سید حامد چانسلر جامعہ ہمدرد اور بحیثیت مہمان خصوصی کپل سبل مرکزی وزیر نے پروگرام کو رونق بخشی۔ سید حامد نے اپنے صدارتی کلمات میں مشاعرے کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ شعرا، سامعین اور ناظم مشاعرہ کو مشاعرے کے عناصر ترکیبی قرار دیا۔ اپنے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کپل سبل نے انگریزی نظم بھی پیش کی اور مشاعرے کی روایت سے ہٹ کر اسے سیاسی رنگ دینے کی بھرپور کوشش کرتے نظر آئے۔ پروگرام کی ابتدائی نظامت ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے کی جب کہ مشاعرے کی باقاعدہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ صدر مشاعرہ سید حامد کے چلے جانے کے بعد مشاعرہ گلزار زتشی دہلوی کی زیر صدارت اختتام کو پہنچا۔ پروگرام کے دوران تھوڑی سی سرگرمی کا ماحول بھی اس وقت پیدا ہوگیا جب شاعر مجید رسولکی کو کلام پیش کرتے ہوئے بزرگ شاعر مخمور سعیدی نے وقت کی قلت کے پیش نظر یہ کہہ کر ٹوکا کہ تقریر کم اور اشعار زیادہ پڑھیے۔ بعد میں ماجد دیوبندی نے اپنے خوبصورت کلام کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اس پراگندگی کو دور کیا بلکہ خوشگوار ماحول پیدا کر دیا۔ اس موقع پر سامعین کی حیثیت سے شاعر اقبال فردوسی، انور باری، شہباز ندیم ضیائی اور سویتا اثیم بھی موجود تھے۔ شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

گلزار زتشی دہلوی، مخمور سعیدی، مظفر رزمی، بیکل اتساہی، ڈاکٹر کلیم قیصر، طاہر فراز، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، ڈاکٹر نزہت انجم، معین شاداب، افضل منگلوری، اعجاز پاپولر میرٹھی، اشوک ساحل، ڈاکٹر کیرتی کالے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

کل اسی موڑ پہ تھا کھیلتے بچوں کا ہجوم
پھول بکھرے تھے جہاں راکھ بچھادی کس نے
معراج فیض آبادی

● نئی دہلی۔ 15 اگست، یوم آزادی کے موقع پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی میں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی جبکہ نظامت منصور عثمانی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کے وزیر ٹرانسپورٹ ہارون یوسف نے شرکت کی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے افتتاحی کلمات ادا کیے جبکہ اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ مندرجہ ذیل شعرا نے اپنا کلام سنایا:

گلزار دہلوی، وقار مانوی، منور رانا، منظر بھوپالی، ڈاکٹر کلیم قیصر، معراج فیض آبادی، اختر شاہجہاں پوری، ملکہ نسیم، طاہر فراز، زبیر ابن سیفی امروہوی، ڈاکٹر نسیم نکہت، ڈاکٹر مجاہد فراز، منصور عثمانی، ابرار کرت پوری، اسرار جامعی، ملک زادہ جاوید، سلیم صدیقی، بازغ بہاری، انور باری، اقبال فردوسی، خرم شاکری، راشد علی شفا، خورشید حیدر، شبینہ ادیب، جاوید مشیری۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

زمیں سے آسماں تک اپنے ہونے کا تماشا ہے
یہ سارے سلسلے اک لمحۂ فانی میں رہتے ہیں
شمیم حنفی

● نئی دہلی۔ 17 اگست، یوم آزادی کے موقع پر آؤٹ ریچ پروگرام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے "جامعہ کا مشاعرہ" جامعہ ملیہ اسلامیہ انصاری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا، جس کی نظامت پروفیسر اخترالواسع نے کی۔ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مشیرالحسن نے نوجوانوں کے آزادی میں رول کو واضح کیا اور نوجوانوں کو اس راستے کو اپنانے کی تلقین کی۔ آؤٹ ریچ پروگرام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کوآرڈی نیٹر رخشندہ جلیل نے تمام مہمانان اور شرکا کا استقبال کیا اور شکریہ ادا کیا۔ شعرا تھے:

پروفیسر زبیر فاروقی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر غضنفر علی، ڈاکٹر رحمٰن مصور، عبید صدیقی، عارف نقوی، محمد اعظم صدیقی، اسرار جامعی، یوسف پاپا، زاہد حسین خان، عمیر منظر، خوشبو سکینہ۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کہاں کمزور دشمن کو سمجھتے ہیں جہاں دیدہ
ذرا سی چوک ہو جائے تو لشکر ہار جاتے ہیں
شمس رمزی

● دہلی۔ 24 اگست، اردو اکادمی دہلی، دہلی سرکار ملتان ایکتا سنگٹھن اور جاگر کتا وکاس سمیتی کے اشتراک سے ایک مشاعرہ بعنوان "قومی یکجہتی" آرام پارک خوریجی دہلی میں منعقد ہوا۔ افتتاح ممبر پارلیمنٹ سندیپ دکشت کو کرنا تھا۔ لیکن مشاعرہ ان کے پارلیمانی حلقے میں ہونے کے باوجود حسب روایت انھوں نے مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ وہ اکثر اردو کے پروگرام میں آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے وزیر خزانہ اور وزیر تعلیم دہلی سرکار بھی ان سے پیچھے نہ رہتے ہوئے مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ مشاعرے کی صدارت سیلم پور کے ممبر اسمبلی چودھری متین احمد کو کرنی تھی۔ وہ بھی نہیں آسکے۔ جب کہ مہمانان اعزازی کے طور پر مدعو پانچ ناموں میں سے صرف اجے چودھری ڈی.سی. پی مشرقی دہلی ہی تشریف لائے۔ پروگرام کے شیڈول کے مطابق اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس کو خیر مقدمی کلمات ادا کرنے تھے۔ وہ بھی غیر حاضر تھے۔ اظہار تشکر کے لیے اکادمی کو گورننگ کونسل کے ممبر تلسی داس دوا اور اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی اسٹیج پر موجود تھے۔ مشاعرے میں ایک خاص

بات یہ رہی کہ کارڈ اور اشتہار میں بی جے پی دہلی پردیش کے صدر ڈاکٹر ہرش وردھن کا کہیں کوئی نام و ذکر نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ بن بلائے مہمان کی طرح مشاعرے میں نظر آئے شاید انھیں کسی نے ذاتی طور پر مدعو کیا ہوگا۔ بہر حال عوام نے ان کے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ قابل غور ہے کہ مشاعرے میں معقول اعزازیہ کے باوجود کوئی بڑا شاعر موجود نہ ہونے کی وجہ سے شعرا کی ٹیم نہایت کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر گلزار دہلوی نے کی۔ حالانکہ مشاعرے کے دوران صدر مشاعرہ کسی بات پر ناراض بھی نظر آئے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید موصوف کی ناراضگی کو قابو کر پانا آسان نہ ہوگا لیکن بعد میں منتظمین و دیگر حضرات کے منانے کے بعد مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ جن شعرا نے مشاعرے میں اپنا کلام پڑھا ان کے اسمائے گرامی ہیں:

گلزار دہلوی، شمس رمزی، ندیم نیر، سرور نگینوی، ثاقب گنگوہی، ہیثم گوپال پوری، معین شاداب، راشدہ باقی حیا، مجیب شہزر، عرفان احمد، کمال جعفری، گز بز سہسوانی، ظاہر بھارتی، نیتا رائیکش، ڈاکٹر پشپا سنگھ وسین، اسلم قریشی، ان کے علاوہ بھی کئی شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

کسی مرتبے کی خواہش نہ مقام چاہتے ہیں
جو بدل سکے زمانہ وہ نظام چاہتے ہیں

حق کانپوری

● نئی دہلی۔ 27 اگست، ریحل کاز کے زیر اہتمام کمیونٹی سینٹر بٹلہ ہاؤس میں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت عظیم اختر اور نظامت اعجاز انصاری نے کی۔ مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے جنرل سکریٹری ایم سلیم نے مہمان خصوصی اور محمود احمد صدیقی نے مہمان ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔ کنوینر کامران صدیقی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر حق کانپوری کو شاعری، مسرور احمد کو سماجی خدمات اور ہرش وردھن کو بہترین استاد کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ منجو چھابڑا کو بھی اعزاز دیا گیا۔ صدارتی تقریر میں عظیم اختر نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ سماجی، ترقیاتی اور بہبود کے کام کرنے والی تنظیم ریحل کاز نے اردو کو فراموش نہیں کیا اور اس مشاعرے کا انعقاد کیا۔ شعرائے کرام تھے:

حق کانپوری، فصیح اکمل، ساحل ساحری، طالب رامپوری، سلیم صدیقی، اعجاز انصاری، سریندر شجر، کمال جعفری، ندیم شاد دیوبندی، کلیم جاوید کرتپوری، ارمان دھام پوری، عتیق ضیا نگینوی، نزہت امروہوی، وارث وارثی، جہاز دیوبندی، تازیہ سحری۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

آساں کچھ بھی نہیں اب تیرے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لیے

شہریار

● علی گڑھ۔ 16 اگست، علی مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام جشن آزادی کے موقعے پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شہریار نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر جاوید مسرت نے شرکت فرمائی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عقیل احمد نے بیرونی و مقامی شعرا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کا ملک کی آزادی سے گہرا رشتہ ہے۔ 1857 سے 1947 تک کی شاعری سماج کی صورت حال کو بیان کرتی؟ انھوں نے کہا کہ اقبال کا خودی کا تصور نفس کی آزادی کا تصور ہے۔ قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر جاوید مسرت نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو زبان نے قومی تحریک میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ملک کی شاید ہی کسی دوسری زبان نے ادا کیا ہو۔ 1857 میں اردو کے پہلے صحافی مولوی باقر کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور سرسید کے رفیق مولانا امام بخش صہبائی کو شہید کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادیبوں اور شاعروں نے ملک کو آزاد کرانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو اکادمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور بہت جلد ہی اس کی عمارت بھی تعمیر ہو جائے گی۔ اس اکادمی کے قیام سے اردو کے فروغ کے لیے عملی کوششیں شروع ہو جائیں گی۔ جشن آزادی کے اس مشاعرے کی نظامت سراج اجملی نے کی۔ اس مشاعرے میں ش۔ کاف نظام، فرحت احساس اور نعمان شوق بیرونی شعرا کے طور پر شریک ہوئے دیگر شعرا تھے: شہریار، زاہدہ زیدی، شہاب الدین ثاقب، مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر معظم خاں، ناصر شکیب، سراج اجملی، راشد انور راشد، ش کاف نظام، فرحت احساس، نعمان شوق، نعمت خاں شروانی، راحت حسن، سریش کمار، رضوان الرضا، سرفراز خالد، امیر امام، بصیر الحسن وفا، کمال اختر، وحید الحق، عابد علی عابد۔

(صحافت، دہلی)

نہیں ہم پر کوئی احساں کسی کا
ہم اپنی آگ ہیں اپنا دھواں ہیں

طالب زیدی

● نوئیڈا۔ 31 اگست، معروف شاعر طالب زیدی نے نوئیڈا میں ایک ادبی شعری محفل کا اہتمام کیا جس کی صدارت منظور عثمانی نے کی اور نظامت کے فرائض طالب زیدی نے انجام دیے۔ سب سے پہلے صدر منظور عثمانی نے ایک انشائیہ بعنوان "شاعر کا اغوا" پڑھ کر سنایا جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ شعری نشست کے انعقاد کے بعد پرتکلف عشائیہ کا بھی اہتمام تھا۔ شعرا تھے: فرحت احساس، طالب زیدی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، اسد رضا، ڈاکٹر حسین ماجد، ملک زادہ جاوید، عبید صدیقی، خسرو متین، احمد علوی، انور رضوی، ہمایوں عابد۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

میری آنکھوں میں جاگتا ہے وہ
اس کی آنکھوں میں سو چکا ہوں میں

کلیم قیصر

● نئی دہلی۔ 26 اگست، ہندوستان کی سرزمین سے ہزاروں میل کے فاصلے پر مشاعروں اور کوی سمیلنوں کا انعقاد میں اس لیے کرتا ہوں تا کہ پردیس کی زمین پر میرے ملک کی تہذیب، ثقافت وروایات کو یاد کیا جاسکے۔ لوگ ان مشاعروں کو اتنا پسند کرتے ہیں کہ اس شوق میں یورپ اور امریکہ سے کھینچ کر دبئی صرف مشاعروں کا لطف لینے چلے آتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ہندوستانی ادب وتہذیب کے دبئی میں علمبردار سید صلاح الدین نے کیا جو یہاں ایک مشاعرے اور کوی سمیلن میں خطاب کر رہے تھے۔ ''ابھی اودے'' کی جانب سے جشن آزادی اور سدبھاؤنا دیوس آنجہانی رہنما راجیو گاندھی کے یوم پیدائش کے موقع پر مشاعرہ اور کوی سمیلن منعقد کیا گیا تھا جس میں سید صلاح الدین کو اعزاز سے نوازا گیا۔ رکن پارلیمنٹ اور اردو پریس کلب کے چیئرمین عبدالرشید شاہین نے انھیں شال پہنائی اور مومنٹو پیش کیا۔ شاعرہ سویتا اسیم اور ان کے رفقا کی کوششوں سے کلیم قیصر کی نظامت میں سامعین کو ایک یادگار مشاعرہ سننے کو ملا۔ شعرا تھے:

کشش وارثی، اقبال اشعر، حق کانپوری، کمار بشواس، فرحت شہزاد، منظر سلطان، ملک زادہ جاوید، میکش امروہوی، کلیم قیصر۔ (صحافت، دہلی)

''مقالات مولانا عرشی''

اور ''آصفی رامپوری: شخصیت اور شاعری''

● یکم ستمبر 2008 فاؤنڈیشن آف کلچر اینڈ لٹریچر کی جانب سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، اسکول آف لنگویجز کے کمیٹی ہال میں ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، کی دو تحقیقی کتابوں ''مقالات مولانا عرشی'' اور ''آصفی رام پوری: شخصیت اور شاعری'' کا اجرا پروفیسر سید امیر حسن عابدی اور پروفیسر سید اختر مہدی نے کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی اور صدارت پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی نے فرمائی۔ اپنی استقبالیہ تقریر میں پروفیسر اختر مہدی نے تحقیقی وادبی خدمات کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہم مولانا عرشی یا آصفی رام پوری کو اس لیے یاد کرتے ہیں کہ انھوں نے ادبی وتحقیقی دنیا میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ دونوں کتابوں کو سراہتے ہوئے پروفیسر اسلم اصلاحی نے فرمایا کہ مولانا عرشی دراصل عربی کے عالم تھے، اس لیے عربی والوں کو ان پر کام کرنا چاہیے تھا۔ فارسی کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر آہن نے ان پر کام کر کے ہم عربی والوں کو بھی ان پر کام کرنے کو آمادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر مولی بخش اسیر نے کہا کہ مولانا عرشی ایک بڑے محقق تھے اور ان کی جن ماخذ تک رسائی تھی، وہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ عرشی پر وہی قلم اٹھا سکتا ہے، جو مولانا کی ہی طرح دقت نظر سے کام لینے والا ہو۔ آصفی رامپوری کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ جس انداز میں انھیں اخلاق آہن نے متعارف کرایا ہے، اس سے ان کی ژرف بینی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے دونوں کتابوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا عرشی کے کام کے مختلف الابعاد وجہات ہیں۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مختلف موضوعات پر کام کیے ہیں۔ ان کے یہاں ان تینوں زبانوں میں جو ذخیرہ ہے وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کے معیار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر آہن نے ان میں وہ تمام پیرامیٹرز استعمال کیے ہیں، جو ایک کامیاب محقق کو کرنا چاہیے۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر امیر حسن عابدی نے ڈاکٹر آہن کے دونوں کارناموں کو سراہا اور کہا کہ ان سے اور بھی اچھے کام کی توقع ہے۔ اس کے بعد پروفیسر بلقیس فاطمہ نے صدارتی کلمات سے نوازا۔ اس موقع پر ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے ریسرچ اسکالر ظفر انصاری ظفر کے اولین شعری مجموعے ''موج موج دریا'' کا اجرا بھی پروفیسر چمن لال اور ڈاکٹر گوبند پرساد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جلسے میں اردو، ہندی، عربی اور فارسی کے اکثر اساتذہ کے ساتھ طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

''ہم سخن فہم ہیں''

● نوئیڈا۔ 31 اگست، اردو فاؤنڈیشن کے جلسے میں رفعت سروش کی نئی کتاب ''ہم سخن فہم ہیں'' کا اجرا اور مشہور شاعر احمد فراز کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا گیا۔ نور جہاں ثروت کی صدارت میں سب سے پہلے متفقہ طور پر احمد فراز کی موت کو اردو کا عظیم نقصان قرار دیا گیا اور شرکائے محفل نے فرداً فرداً اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کی موت ہند و پاک دوستی کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ ان تاثرات میں رفعت سروش، اسد رضا، بی ایس جین جوہر، پی پی سریواستو رند، قمر سنبھلی اور ڈاکٹر ذکی طارق شامل تھے۔ اس کے بعد رفعت سروش کی 57 ویں کتاب ''ہم سخن فہم ہیں'' کا اجرا نور جہاں ثروت کے ہاتھوں عمل میں آیا جس میں رفعت سروش کے 19 غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''شاہجہاں نامہ''

● نئی دہلی۔ 27 اگست، مکتبہ الحسنات کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل

سینٹرنئی دہلی میں جاری بین الاقوامی اسلامی کتاب میلے میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے ہاتھوں تاریخی کتاب ''شاہجہاں نامہ'' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس اجرائی تقریب میں عبدالمالک فہیم، محمد یوسف، فیصل فہیم، کہکشاں تیاگی اور شہزاد عالم و دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔ کتاب میں مغل بادشاہ، شاہجہاں کی حکومت اور ان کی پوری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فیصل فہیم نے بتایا کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور اس کی پہلی بار اشاعت ہورہی ہے۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ فارسی کے مصنف ملا محمد صالح ہیں، جبکہ اس کا اردو ترجمہ ممتاز لیاقت نے کیا ہے اور اسے مکتبہ الحسنات نے شائع کیا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ مکتبہ الحسنات کا اسلامی کتاب میلہ ایک اچھی کوشش ہے۔ انھوں نے اس میلے کی سراہنا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی سرگرمی مسلسل ہونی چاہیے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

''پرچھائیاں خیالوں کی''

● نئی دہلی۔ 22 اگست، ادبی تنظیم بزم شہناز کے زیر اہتمام حسنین سائر کے پہلے شعری مجموعے ''پرچھائیاں خیالوں کی'' کا اجرا جماعت اسلامی ہند کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ مولانا سید جلال الدین عمری نے جلسے کی صدارت کی، جبکہ مہمان خصوصی قاری ابوالحسن اعظمی تھے۔ مولانا سید جلال الدین عمری نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ زندگی کے اعلیٰ مقصد کی پاسداری اور مزاج کی سادگی حسنین سائر کی دو اہم خوبیاں ہیں۔ یہی دونوں اہم خوبیاں ہمیں ان کے مجموعۂ کلام ''پرچھائیاں خیالوں کی'' میں بھی ملتی ہیں۔ سید محمد جعفر نے کتاب کی معنوی وصوری دونوں خوبیوں کو سراہا۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے متانت اور سنجیدگی کو حسنین سائر کی شاعری کا جوہر قرار دیا۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے کتاب کی اشاعت پر حسنین سائر کو مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر شہزاد انجم نے حسنین سائر کی شاعری میں شعریت و معنویت کی تحسین کی۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے حسنین سائر کو ان کے مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی۔ پروگرام کے آغاز میں مولانا اجمل فاروق ندوی اور عمیر منظر نے حسنین سائر کی شاعری سے متعلق اپنے مضامین پیش کیے۔ درمیان میں حسنین سائر سے دو غزلیں سنی گئیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ جلسہ کا آغاز قاری ابوالحسن اعظمی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا جبکہ نظامت عمیر منظر نے کی۔ کنوینر جلسہ ضمیر اعظمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''داستان دہلی''

● نئی دہلی۔ 13 اگست، دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے آج معروف صحافی آدتیہ اوستھی کی کتاب ''داستان دہلی'' کا اجرا کیا۔ پروگرام کی صدارت مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ شری پرکاش جیسوال نے کی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ یہ کتاب دہلی کی عکاس ہے اس میں کچھ ایسی سچائیاں بیان کی گئی ہیں جو بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دہلی پر اب تک کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے آپ میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کافی تحقیق کے بعد قلم بند کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آدتیہ اوستھی کی یہ پہلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ (سمارا سماج، دہلی)

''اب شام ہوگئی''

● بھوپال۔ 18 اگست 2008 کو مشہور طبلہ نواز پدم بھوشن احمد جان تھرکوا مرحوم کے صاحبزادے اور معروف شاعر جناب رضا رامپوری کے شعری مجموعے ''اب شام ہوگئی'' کی رسم اجرا گورنر مدھیہ پردیش ڈاکٹر بلرام جاکھڑ صاحب کے دستِ مبارک سے راج بھون کی ایک سادہ تقریب میں ادا کی گئی۔ اس مجموعے کو جناب مقبول واجد، جنرل سکریٹری، شعری اکادمی بھوپال، نے شائع کیا ہے۔ اس موقع پر جناب رضا رامپوری منظر بھوپالی، مقبول واجد، وجے تیواری، انوار اسلام، احمد الدین اشرف، سید مقبول حسین، حافظ فیاض احمد، ولی اللہ ولی، مہیش چوہان، سریہ پرکاش استھانہ و دیگر معزز شہری موجود رہے۔

(ڈاک سے)

یادِ رفتگاں

● ''اقبال ماہر اگرچہ کلاسیکی مزاج رکھتے تھے۔ حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے لیکن الہٰ آباد میں ان کا ساتھ ترقی پسندوں سے ہوا تو ان کے نظریات میں تبدیلی آئی اور وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے اور آخر وقت تک ترقی پسند ہی رہے۔ پرانی تہذیب ان میں رچی بسی تھی۔ میں ان کو ایک سنجیدہ قسم کا شاعر مانتا ہوں۔'' یہ خیالات پروفیسر سید محمد عقیل نے اقبال ماہر کی تعزیتی نشست میں ظاہر کیے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ اقبال ماہر گہرا سماجی اور سیاسی شعور رکھتے تھے الہٰ آباد سے ان کا گہرا جذباتی لگاؤ تھا ان کا شعری مجموعہ ''دیار گنگ و جمن'' اس کا ثبوت ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی حسیت بدرجۂ اتم تھی۔ ڈاکٹر فخر الکریم نے کہا کہ وہ خود تو عمدہ شاعر تھے ہی اس عہد کے جتنے بڑے شعرا تھے ان سب سے ان کے مراسم تھے۔ سادگی اور ایمانداری شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی تھی۔ خواجہ جاوید اختر نے کہا کہ وہ جدیدیت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور کٹر ترقی پسند تھے لیکن کبھی اختلاف کو

مخالفت یا عداوت کی شکل نہ دیتے تھے بہت نیک اور شریف انسان تھے۔ سبق اردو کے ایڈیٹر دانش الٰہ آبادی نے اپنے رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بار بار ان سے ملتے تھے انھوں نے چند نظمیں بھی عنایت کیں جو میں نے رسالے میں شائع کیں۔ وہ بہت سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ جلسے میں مشتاق عامر اور حسنین اختر نے بھی اظہار خیال کیا۔ چند طلبہ و طالبات نے بھی اقبال ماہر کی شخصیت و شاعری پر روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 27 اگست، اردو کے بے باک صحافی اور اردو ٹائمس ممبئی کے ایڈیٹر معین الدین منظور احمد کے مشن کو آگے بڑھانا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ مرحوم کے لیے بہترین خراج عقیدت ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار رکن پارلیمنٹ عبدالرشید شاہین نے کیا۔ وہ روزنامہ ''ہمارا سماج'' کے دفتر میں معین الدین منظور احمد کے انتقال پر منعقدہ تعزیتی نشست میں بطور صدر اپنے تاثرات پیش کر رہے تھے۔ نشست کا آغاز افضل مصباحی کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔ اس موقع پر دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال فاروقی، دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی، ہمارا سماج کے ایڈیٹر خالد انور، اردو آفیسر دہلی سرکار ڈاکٹر اشفاق عارفی، روزنامہ صحافت کے بیورو چیف خرم رضا، راشٹریہ مسلم منچ کے گریش جویال وغیرہ نے بھی اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔ نشست کی نظامت اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی نے کی۔ کمال فاروقی نے کہا کہ آج ہندوستان میں اردو صحافت جو مقام بنا رہی ہے ایسے موقع پر معین الدین جیسے صحافی کا ہمارے درمیان سے رخصت ہونا بہت افسوس ناک ہے اور یہ اردو صحافت اور قوم وملت کے لیے بہت نقصان کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم سے میری ملاقات رہی ہے اور ان کا اخبار بھی میں پڑھتا رہا ہوں جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی بے باک صحافت کرتے تھے۔ ان کے قلم سے نکلنے والے الفاظ اور اخبار میں شائع ہونے والی خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ملک اور قوم کے تئیں کس قدر وفادار اور محبت کرنے والے تھے۔ وہ دہلی سے اردو ٹائمس کو شروع کرنے والے تھے جو بہت ہی خوشی کی بات تھی ہم امید کرتے ہیں اس سلسلے کو کوئی نہ کوئی جاری رکھے گا۔ خالد انور نے کہا کہ معین الدین نے اخبار کو ایک مشن بنایا تھا۔ وہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی آواز تھے۔ وہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کو احساس جرم سے باہر نکالنے کے لیے مستقل جدوجہد کر رہے تھے۔ خراب حالات میں مورچہ سنبھالا تھا جس کی وجہ سے ان کے ایک صحافی کو پوٹا کے تحت جیل میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔ ایسے بے باک سنجیدہ صحافی کا ہمارے درمیان سے جانا یقیناً بہت بڑا نقصان ہے۔ مرغوب حیدر عابدی نے کہا کہ معین الدین کم عمر میں جس طرح صحافت کو لے کر سنجیدہ تھے مستقبل میں ضرور کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتے۔ ڈاکٹر اشفاق عارفی نے کہا کہ مرحوم کا اخبار اردو ٹائمس خبروں، زبان و بیان اور سرخیوں کے اعتبار سے کافی اچھا تھا اور یہ خوشی ہوئی تھی کہ وہ دہلی سے بھی شروع کر رہے تھے۔ خرم رضا نے کہا کہ معین الدین کی آنکھوں میں اردو صحافت کو لے کر اتنے بڑے بڑے خواب تھے کہ اگر وہ پورے ہوتے تو اردو صحافت کا معیار مزید بلند ہوتا لیکن ان کے انتقال سے اردو صحافت کو کافی نقصان ہوا ہے۔ اس موقع پر ہمارا سماج کی جانب سے ایک تعزیتی قرارداد بھی پیش کی گئی جس میں مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی اور ان کے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● رامپور۔ 19 اگست، قصبہ نوگانواں سادات ضلع جے پی نگر امروہہ کے مشہور شاعر عبدالغفار قمر نوگانوی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ نوگانواں سادات کی ادبی تنظیم بزم ادب کے جنرل سکریٹری زوار نیر نوگانوی نے بتایا کہ قمر نوگانوی عرصۂ دراز سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ موصوف قصبہ کے کہنہ مشق اور بسیار گو شاعر تھے۔ ان کی وفات سے قصبے کے ادبی افق پر ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن نعت و مناقب و سلام و مراثی میں بھی اپنا مقام رکھتے تھے۔ مرحوم ابرار حسنی گنوری کے تلامذہ میں تھے۔ ان کی صحبت سے بہت سے نوجوان مستفیض ہوئے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

□□□

کلیات سعادت حسن منٹو جلد دوم

مرتب: شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے سحر نے لوگوں کو ان کے روایتی افسانہ نگاری سے انحراف، موضوعات کے انتخاب، تکنیک کے تنوع، زبان کی شکست وریخت کے تجربے، اہم فکر کو سہل انداز میں بیان کرنے کے سلیقے اور کہانی گھڑنے کے ہنر جیسی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہونے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا۔ منٹو نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، خطوط، فیچر، فلم اسکرپٹ، خاکے اور مضامین بھی لکھے ہیں جن میں فنی حسن اور جذبے کی صداقت ان کے افسانوں سے کسی طور کم نہیں۔ کلیات کی اس دوسری جلد میں منٹو کی پانچ کتابیں ''افسانے اور ڈرامے''، ''چغد''، ''لذت سنگ''، ''سیاہ حاشیے'' اور ''خالی ڈبے خالی بوتلیں'' شامل ہیں۔

صفحات — 575، قیمت — 274 روپے

تبصرہ وتعارف

● منتخب التواریخ

مصنف: ملا عبدالقادر بدایونی

مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خان

صفحات: جلد اوّل 409، جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل 335 روپے، جلد دوم وسوم 555 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: وسیم اقبال، محلّہ قاضی سرائے اوّل، نگینہ، ضلع بجنور، یوپی

ملا عبدالقادر بدایونی عہد وسطیٰ کے معروف مورخ ابوالفضل کے معاصر ہیں، جسے دربار اکبری میں نہایت معتبر رتبہ ملا ہوا تھا۔ ملا عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی کی ولادت 947 ہجری قمری میں بدایوں میں ہوئی۔ انھوں نے میر محمد مکی سے قرآن پڑھا جو سات قرأتوں کے ماہر تھے۔ وہ لڑکپن سے ہی بڑے ذہین تھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو قادری تخلص اختیار کیا۔ فن تاریخ گوئی میں ان کا منفرد مقام ہے۔ 981 ہجری قمری میں بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ دربار کی طرف سے انھیں تصنیف وتالیف کے علاوہ کتابوں کا انتخاب بھی تفویض ہوا۔ نہایت دیانت دار اور شریف النفس انسان تھے۔ کوئی بات تحقیق کے بغیر کہنے کے قائل نہ تھے۔ ''منتخب التواریخ'' جلد اوّل میں صفحہ نمبر 10 پر وہ خود رقم طراز ہیں:

''چونکہ میری اس تحریر کا مقصد دیانت اور ایمانداری کا پرچم بلند کرنا ہے، اگر اتفاقاً کوئی سہو اور لغو الفاظ زبانِ قلم پر آجائیں تو امید ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ سے اپنے کرم عمیم سے درگذر کرے گا اور بخش دے گا۔''

ظاہر ہے وہی کتاب قارئین کی بھی توجہ کا مرکز بنتی ہے جو غلو سے پاک اور حقیقت بیانی پر مبنی ہو۔ زیر تبصرہ کتاب ''منتخب التواریخ'' جس کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے ملا عبدالقادر بدایونی کی ایک ایسی ہی تصنیف ہے جو حقیقت بیانی پر مبنی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ مصلحت اندیشی اور دور بینی کے پیش نظر مصنف نے اپنی حیات تک اس تالیف کو راز میں رکھا۔ مگر جب عہد جہانگیری میں اس کا شہرہ ہوا، تو جہانگیر نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بچوں کو بلا کر عتاب کیا۔ باز پرس پر انھوں نے کہا کہ ''ہم تو چھوٹے اور ناسمجھ تھے ہمیں اس کا کیا علم ہوسکتا ہے۔'' انھوں نے ایک مچلکہ لکھ کر جہانگیر کو دیا کہ ''یہ کتاب ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے مستحق ہوں گے۔'' اس کتاب میں مصنف نے جلال الدین محمد اکبر کے 60 سالہ واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے اور آخر کے دو برسوں کے حالات کو مصنف نے خود جمع کیا ہے۔

عہد اکبری کے واقعات اور معاملات کو صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور کوئی رائے قائم کرنے میں جس طرح ''اکبرنامہ'' بے حد معاون ہے، ٹھیک اسی طرح ''منتخب التواریخ'' بھی۔ بلکہ ''اکبرنامہ'' تو ایک ایسی تاریخ ہے جسے بادشاہ وقت کی رائے، مرضی اور مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے اور مصنف کو اس کی خوشنودی مطلوب ہے۔ جبکہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کو دخل نہیں۔ اسی لیے اس میں اختلاف رائے اور کہیں شدید تنقید بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''اکبرنامہ'' میں اس قسم کے اندراجات نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں عہد اکبری کے معاملات کو معروضی طریقے سے جاننے اور سمجھنے کے لیے ''اکبرنامہ'' کے علاوہ ''منتخب التواریخ'' سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔

فارسی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر علیم اشرف خاں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ مترجم کو فارسی زبان وادب پر عبور حاصل ہے اور ملک وبیرونِ ملک میں فارسی زبان وادب کی ترقی وترویج میں سرگرم عمل بھی ہیں۔

تین جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی جلد اوّل میں جو کہ کل 409 صفحات پر مشتمل ہے، حمد ونعت اور سبب تالیف کے بعد غزنوی عہد حکومت سے عہد ہمایونی تک کے تمام حکمرانوں کی مختصر اور جامع تاریخ بیان ہوئی ہے کہ اس درمیان میں کس کس نے، کہاں کہاں اور کس انداز سے حکومت کی ہے۔ اس طرح جلد اوّل عہد ہمایونی کے شعرا کے مختصر تعارف کے بعد مکمل ہوگئی ہے۔ جس کا ماخذ ''تاریخ مبارک شاہی'' اور ''نظام التواریخ'' ہیں اور آخر کے دو برسوں کے حالات کو مصنف نے خود جمع کیا ہے۔ جلد دوم: میں ''فنِ تاریخ کی اہمیت'' اور ''مصنف کے مآخذ'' کے عنوان سے مختصر عبارتوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر کی تخت نشینی سے لے کر اکبر کے دور حکومت کی مکمل تاریخ بیان ہوئی ہے۔ جہاں مصنف کو اکبر سے جہاں جہاں اختلاف ہے وہاں شدید تنقید بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف خود اکبر کے دربار میں رہا ہے اور اسے اکبر کو قریب سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ جلد سوم: میں علی الترتیب عہد اکبر کے مشائخین، علما، حکما، شعرا کے مکمل حالات بیان کیے گئے ہیں اور مناجات پر کتاب مکمل ہوگئی ہے۔

مترجم ایک مشاق مترجم ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترجمے میں اصل تصنیف کا انداز پیدا کردیا ہے۔ کتاب معلومات کا مخزن ہے اور یہ معلومات محض تاریخی نہیں، مذہبی، ادبی، سماجی، معاشی اور معاشرتی بھی ہیں۔

قابلِ تحسین ہیں قومی اردو کونسل کے موجودہ ذمے داران کہ جن کے زیرِ نگرانی اتنی اہم کتاب کا اردو میں ترجمہ شائع ہوا۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب تاریخ کے طلبہ کے علاوہ تاریخ پر کام کرنے والے اہلِ علم حضرات کے لیے بھی بے حد کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اس لیے بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ تاریخ کے شائقین اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

● جامع التذکرہ (جلد سوم)

مولف: محمد انصار اللہ

صفحات: 965، قیمت: 346 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ابوبکر عباد، لیکچرار شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مالک رام، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کے بعد ہمارے عہد میں ان کی روایت کے پاسبان جو برگزیدہ محققین ہیں ان میں ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر انصار اللہ کے نام اہم ہیں۔

پروفیسر انصار اللہ صاحب ایک عرصے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت استاد شعبۂ اردو سے وابستہ رہے ہیں اور قدیم علمی متون ان کے مطالعے کا مخصوص میدان رہا ہے، غالب بلیو گرافی، عبدالغفور نساخ اور پنڈت شیو نرائن برت پر تحقیقی کتابوں کے علاوہ ان کے متعدد تحقیقی کارنامے اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

انصار اللہ صاحب طبعاً خاموش پسند اور گوشہ نشیں ہیں، اور تحقیقی کاموں سے اعتقاد کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ قومی کونسل نے اردو تذکروں کی تاریخ لکھنے کے ایک بڑے اور اہم پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جامع التذکرہ کے نام سے اس سلسلے کی تیسری جلد منظرِ عام پر آچکی ہے۔ یہ تیسری جلد بھی اپنی سابقہ جلدوں کی طرح تین حصوں پر مشتمل ہے۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین، پہلے حصے میں ابتدا سے شاہ عالم ثانی کے عہد تک کے شعرا کے تذکرے شامل ہیں جو 1806 تک کے عرصے کو محیط ہے۔ اس میں چار سو تیس شعرا کے احوال مذکور ہیں۔ دوسرا حصہ اکبر شاہ ثانی کے عہد تک کے شعرا پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ 1806 سے 1837 تک کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں سات سو شعرا کے حالات درج ہیں۔ آخری حصے میں عہد بہادر شاہ ثانی کے شعرا کے حالات بیان ہوئے ہیں یہ حصہ 1837 سے 1857 تک کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے میں نو سو پچاسی شاعروں کے احوال مذکور ہیں۔

یہ جلد 14 متداول تذکروں پر مشتمل ہے، ان میں سے چند تذکرے اپنی انفرادیت اور جدت کی بنا پر قابلِ ذکر ہیں، مثلاً ''تاریخ جدولیہ'' مولف خادم علی فاروقی سندیلوی، اس تذکرے میں سلاطین، امرا اور شعرا وغیرہ کے حالات بصورت جدول اختصار سے لکھے ہیں، ''خوش معرکۂ زیبا'' مولف سعادت علی خاں ناصر، یہ تذکرہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں استادی شاگردی کے تعلق سے شاعروں کے حالات یکجا کیے گئے ہیں، ''سراپا سخن'' مولف سید محسن علی محسن، اس تذکرے میں مولف نے اعضائے جسمانی سے متعلق متعدد شعرا کے کلام کو جمع کرکے اپنی جدتِ طبع کا ثبوت دیا ہے، ''گلستانِ سخن'' مولف مرزا قادر بخش صابر دہلوی، مرزا قادر بخش چونکہ بادشاہ معزالدین جہاندار شاہ کے پوتے تھے اس لیے لال قلعہ کے معاملات اور واقعات سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے انھوں نے بہت شوق سے معاصرین کا یہ تذکرہ لکھا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آخری مغل تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی کے عہد میں شعرائے اردو کے بہترین تذکرے لکھے گئے، تاریخی شعور اور تحقیق و تجسس کا شوق اس زمانے کے تذکروں کے نمایاں اوصاف ہیں، اور ابتدائی تذکروں کی خامیوں سے بھی یہ کافی حد تک پاک ہیں۔ واضح ہو کہ جامع التذکرہ میں پروفیسر انصار اللہ صاحب نے ابتدا سے 1857 تک کے تمام تذکروں کو تین جلدوں میں یکجا کیا ہے، جس میں کئی کمیاں بھی رہ گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ پہلے دور کے تذکروں میں جن شاعروں کا ذکر ہے ان میں سے بعض کا ذکر دوسرے دور کے تذکروں میں بھی ہے اور آخری دور کے حصے میں پہلے اور دوسرے دور کے بعض شعرا کے تذکرے بھی در آئے ہیں۔ اسی طرح پہلی جلد کے بعض شعرا کی تکرار دوسری جلد میں موجود ہے اور تیسری جلد میں پہلی اور دوسری جلد میں مذکور بہت سے شعرا کے احوال کی تکرار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مولف نے 1800 سے 1857 تک کے تمام تذکروں میں شامل شعرا کے احوال کو عہدوار تین جلدوں میں تین تین حصوں میں مرتب کردیا ہے۔ یوں بہت سے شعرا کے احوال کی تکرار تینوں جلدوں میں ہے۔ مثلاً شیخ نجم الدین آبرو، سراج الدین علی خاں آرزو اور انشاء اللہ خاں انشا کے احوال تینوں جلدوں میں موجود ہیں۔

بہتر یہ ہوتا کہ تمام تذکروں میں مذکور شعرا کے احوال کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے الگ الگ جلدوں یا الگ الگ حصوں میں مرتب کیا جاتا اور جن جن تذکروں میں ان کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں ان کے حوالے دے دیے جاتے۔ تاکہ قاری ایک ہی شاعر کے احوال پڑھنے کے لیے جامع التذکرہ کی تینوں جلدیں دیکھنے کے دشوار عمل سے بچ جاتا۔ اسی طرح انھوں نے فارسی تذکروں کا ترجمہ کرنے کے بجائے صرف انفارمیشن لے لی ہے جس سے تذکرہ نگاروں کا عندیہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ پھر بھی پروفیسر انصار اللہ کا یہ کام یوں لائقِ احترام ہے کہ 1857 تک کے تمام تذکروں کی معلومات انھوں نے تین جلدوں میں جمع کردی ہیں۔ جو بہرحال اس عہد کا ایک اہم کام ہے۔

●افادات

مصنف: خورشید لکھنوی

صفحات: 104، قیمت: 62 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ارجمند آرا، لیکچرار شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

''افادات'' رسالہ ہے جو خورشید لکھنوی نے اپنے شاگردوں کے استفادے کے لیے 1889 میں تحریر کیا تھا۔ خورشید لکھنوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے چچازاد سید محمد جعفر امید سے اصلاح لی تھی اور ان کے انتقال کے بعد نواب آغا محمد صاحب ہندی کے شاگرد ہو گئے تھے جو نواب رام پور کی سرکار میں ملازم تھے۔ خورشید نے یہ رسالہ 33 برس کی عمر میں تحریر کیا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ چودہ پندرہ برس کی عمر سے شعر کہہ رہے تھے۔ گویا یہ رسالہ ان کے شعر گوئی کے 19 برس کے تجربے کا نتیجہ ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں خورشید نے بہ حیثیت شاعر اپنے حالات بطور تذکرہ تحریر کیے ہیں تاکہ تذکروں کے لیے جو لوگ فرمائش کرتے ہیں، ان کے لیے بار بار لکھنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ اس حصے میں انھوں نے اپنی شعر گوئی کا احوال اور اپنے اساتذہ سے استفادے کا ذکر پرلطف انداز میں اس طرح کیا ہے کہ ان کی شخصیت اور اصلاح دینے کے طریقوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بیچ بیچ میں ایسے واقعات کا بھی ذکر ہے جن سے معاصرین کے ساتھ خورشید کی چشمکوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بیشتر استادانِ فن کی طرح اپنے تمام تر منکسر لہجے کے باوجود اپنی زباں دانی، شعر گوئی اور فارسی پر عبور کے لیے تفاخر کا احساس صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس حصے میں خورشید لکھنوی نے اپنے استاد اور چچازاد بھائی امید کے اور اپنے ایک عم زاد سید مہدی حسین ماہر کے کچھ اشعار ہدیۂ ناظرین کیے ہیں۔ اپنا بھی دو مختلف ادوار کا کلام نقل کیا ہے جس کا مقصد اپنے دونوں طرزوں کو قاری تک پہنچانا ہے۔ طرزِ اوّل کے طور پر انھوں نے 42 اشعار پر مشتمل جو غزل دی ہے اس میں ان کے استادی کے فنکارانہ جوہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں چار مطلعے ہیں اور اس میں التزام یہ ہے کہ ایک ہی قافیے میں عطف و اضافت کا تجربہ کیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اثر دیکھے کوئی میرے جنونِ عشقِ پنہاں کا
صدا دیتا نہیں ہے چاک بھی جیب و گریباں کا
نہ چھوڑا ساتھ مجھ وحشی کا اک دم جوشِ وحشت میں
بنادستِ جنوں بازو درِ چاکِ گریباں کا
وہ سودائی ہوں دستِ قاصدِ جاناں میں گھبرا کر
بجائے نامہ پرزہ دے دیا جیب و گریباں کا

ویسے خورشید بجائے خود عطف و اضافت کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ''میں نے ایک غزل جناب منشی منیر مرحوم کی اسی قافیے میں اسی پابندی کے ساتھ دیکھی تھی تو اپنی طبیعت کا امتحان مجھے خود منظور ہوا کہ دیکھوں مجھ سے بھی اس قید سے ایک ہی قافیے میں کچھ شعر نکل سکتے ہیں یا نہیں۔'' خورشید نے اپنے طرزِ ثانی کے جو اشعار درج کیے ہیں ان میں سے کچھ شعر ہم بھی پڑھتے چلیں:

نکل ہی آئے گا مطلب کہ ضد مزاج میں ہے
وفا کا شکوہ کروں شکر بے وفائی کا
خفا ہوئے ہیں تو ہوں دل کا آسرا تو نہیں
یہ بُت حسین و طرح دار ہیں، خدا تو نہیں
تحریر ہے نہیں کی جگہ ہاں جواب میں
لکھتے تو کچھ تھے لکھ گئے کچھ اضطراب میں

اس کے بعد خورشید نے اپنے مرثیہ گوئی کی جانب مائل ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ یہ تمام سوانحی حالات اور شعر گوئی کے نمونے کتاب کے 35 صفحات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کا اب وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو متروکات کی بحث، بیانِ عروض و قافیہ، بیانِ فروغ اور تفصیلِ بحور، مع مثنوی و مرثیہ پر مشتمل ہے۔ متروکات کی بحثیں مدلل ہیں اور جن متروکات کو فصحا اور کاملینِ فن کے ترک کر دینے کے باوجود خورشید نے ترک کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس کی وجوہ بھی انھوں نے بیان کی ہیں۔ بیانِ عروض و قافیہ کے ضمن میں رسالے کے شروع میں ہی انھوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ صرف انھی بحور و اوزان کا ذکر کروں گا جو متداولہ ہیں اور انھی زحافات کا بیان جو بحورِ مذکور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصد انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سے ان کے تلامذہ اور احباب کو انھیں یاد کرنے میں آسانی ہوگی اور ایسے وزن جو اس زمانے میں رائج نہیں، ان کے بیان سے کچھ حاصل نہیں۔

غرض یہ کہ یہ کتاب شعرا اور فنِ شاعری سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب اب سے پہلے اتر پردیش اردو اکادمی نے 1982 میں شائع کی تھی۔ اس کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمایے میں ہوتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر قومی اردو کونسل نے اتر پردیش اردو اکادمی کے ساتھ ایک مشترکہ معاہدے کے تحت اس کو شائع کیا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس اہتمام سے اسے شائع ہونا چاہیے تھا اس کا التزام نہیں کیا گیا، مثلاً کتاب میں ناشرین کی طرف سے ایک نوٹ ہونا چاہیے تھا جس میں مصنف اور کتاب کے موضوع سے متعارف کرایا جاتا۔ کتاب کے آٹھ دس صفحات پڑھے بغیر یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کتاب کس موضوع پر ہے، یہ بھی پتا نہیں چلتا کس عہد میں لکھی گئی، لکھنے والے کے کوائف کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کتاب کے ترقیمے سے جا کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب ''ختم جمادی الثانی 1307ھ'' کو ختم ہوئی۔ باقی تحقیق کا کام قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کا عیسوی سنہ دریافت کریں، اور مصنف کے عہد کا اندازہ لگائیں۔ امید

رکھنی چاہیے کہ اس کی آئندہ اشاعت میں قومی اردو کونسل کسی محقق اور ادب کے مورخ سے ایک تعارفی مضمون خورشید لکھنوی کے بارے میں بھی شاملِ اشاعت کرے گی۔

● دکنی نثر کا انتخاب

مرتب: پروفیسر سیدہ جعفر

صفحات: 172، قیمت: 48 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: احمد کفیل، 29، اولڈ برہم پتر ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

پروفیسر سیّدہ جعفر نے دکنی ادب اور اس کی تحقیق و تنقید میں اپنی امتیازی پہچان بنائی ہے ان کے انھی تجربات کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے ان سے ''دکنی نثر کا انتخاب'' کی ترتیب و تدوین کرائی ہے۔ اس سے قبل کونسل سے شائع شدہ ان کی کاوش ''کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ'' سنجیدہ قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکی ہے۔

''دکنی نثر کا انتخاب'' دکن کے چودہ مصنفین کی تصانیف کے منتخبات پر مشتمل ہے جس سے دکن میں زبان و طرزِ بیان کی تدریجی ارتقائی منزلوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دکن میں اردو شعر و نثر کو ہر حلقے میں پایۂ اعتبار حاصل ہوا، دکنی ادبا، شعرا، مورخین، علما اور صوفیا کی خدمات اور اردو سے ان کی بے لوث محبتوں نے اردو کو شاہی دفتر تک پہنچا دیا تھا۔ اردو شاعری کی طرح اردو نثر کی ابتدا بھی یوں تو شمالی ہند سے ہوتی ہے لیکن اس کی منظم صورتیں دکن میں پروان چڑھتی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ابتدا میں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ یہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور عوام کو شرابِ معرفت سے سرشار کرنے کے لیے اپنی زبان کو عوام کی زبان سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کر رہے تھے جو ان کا اصل مقصد تھا لیکن اس کے زیر اثر ہندوستان میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ رہی تھی جسے ہم آج اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ جب ہم اردو نثر کے اولین نمونوں پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلا نمونہ مولانا سید مبارک کی تالیف ''میرالاولیا'' میں محفوظ صوفیا کے ملفوظات پر ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن انھیں باضابطہ نثر نہیں کہہ سکتے۔ ان عارفین کو اپنے معتقدین اور مریدین کی ہدایت کے لیے ان کے سوالات کے جواب لکھنے پڑے تو انھوں نے نظم و نثر میں رسالے لکھنے شروع کیے اور اس طرح سے اردو کے نثری سفر کا آغاز ہوا۔

ایک زمانہ تھا کہ شمالی ہند میں فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' کو نثری میدان میں اولیت حاصل تھی لیکن تب ہماری تحقیق اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ 1928 میں محی الدین قادری زور نے ''اردو شہ پارے'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی اور 28-1927 کے آس پاس ہی دکنی ادب پر ڈاکٹر عبدالحق کے کئی تحقیقی مقالے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے جن سے دکنیات پر تحقیق کا نیا باب کھلا۔ نئی تحقیق کے نتیجے میں منضبط نثری تصانیف کے معرضِ وجود میں آنے کا سہرا شمالی ہند کے بجائے سرزمین دکن کے سر بندھا اور یہ تاجِ افتخار حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز کے سر پر رکھا گیا۔ لیکن مزید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ ''معراج العاشقین'' گیسو دراز کی تصنیف نہیں اور نہ ہی یہ کتاب ان کے عہد میں لکھی گئی بلکہ ''معراج العاشقین'' بہت بعد کے صوفی ادیب مخدوم شاہ حسینی کی ''تلاوۃ الوجود'' کی بے ربط تلخیص ہے۔ (تلاوۃ الوجود کا انتخاب بھی اس کتاب میں شامل ہے) حالیہ تحقیق کی رو سے اردو نثر کا پہلا مستحکم نمونہ برہان الدین جانم کی کتاب ''کلمۃ الحقائق'' ہے جو برہان الدین کی اول تصنیف ارشاد نامہ (1583) کے بعد لکھی گئی۔ چونکہ جانم کی کتاب ''کلمۃ الحقائق'' کو اردو نثر میں اولیت کا درجہ حاصل ہے اس لیے زیر تبصرہ کتاب کا نثری انتخاب بھی ''کلمۃ الحقائق'' سے ہی شروع ہوتا ہے۔

''دکنی نثر کا انتخاب'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر سیّدہ جعفر نے دکنی نثر پاروں کا انتخاب کرتے وقت اردو نثر کی ارتقائی منزلوں کو کس دانشمندی سے ملحوظِ نظر رکھا ہے۔ انھوں نے مصنفین کے ایسے نثر پاروں کا انتخاب کیا ہے جو مصنفین کے مخصوص طرز کی ممکنہ حد تک نمائندگی کرتے ہیں۔ مصنفین کے احوال و آثار کے جائزے میں خاص طور سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ متعلقہ تصنیف کس ماحول میں وجود میں آئی۔ دکنی الفاظ اور سنسکرت کے تت سم اور تت بھو کا بکثرت استعمال اور دکنی عبارتوں کے بیچ جگہ جگہ فارسی جملے کیا معنی رکھتے ہیں، ان کاوشوں کا بھی جن کی بنا پر ان ابتدائی نثری تصانیف میں انشا کے محاسن کی جھلک دکھائی پڑتی ہے، باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ دکنی نثر کے اس انتخاب میں سات نثری نمونے ایسے ہیں جو مخطوطات کی شکل میں دکن کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں تین کتابیں— طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی اور ملکہ زمان و کام کندلہ، ایسی ہیں جن کے مصنفین کا اب تک پتا نہیں چل سکا ہے مگر ان کتابوں کی نثر کی دلکشی قاری کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتی ہے کہ ''باغ و بہار'' کی عبارت ان کتابوں کی عبارت سے کسی قدر قریب ہے۔ دیگر مخطوطات جن سے مدد لی گئی ہے ان میں عابد شاہ کی ''گلزار السالکین'' شاہ سلطان ثانی کی ''دارالاسرار''، معظم بیجاپوری کی ''شرح شکارنامہ''، اور مخدوم شاہ حسینی کی ''تلاوۃ الوجود'' ہیں۔ مطبوعہ کتب میں برہان الدین جانم کی ''کلمۃ الحقائق''، امین الدین اعلیٰ کی ''کلمۃ الاسرار'' اور ''گفتار شاہ امین'' ملا وجہی کی ''سب رس''، میراں جی خدا نما کی ''شرح شرح تمہیدات عین القضات''، ''رسالۂ وجودیہ'' اور ''شرح مرغوب القلوب''، میراں یعقوب کی ''شمائل الاتقیا''، محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہیلی'' اور شمس الدین کی ''حکایات الجلیلہ'' ہیں۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ دی گئی ہے جس میں مشکل دکنی الفاظ کے معنی جدید اردو میں دیے گئے ہیں۔

□□□

بدر متین

سنہرا ہنس

کسی گاؤں میں فضلو نام کا ایک کسان رہتا تھا۔ فضلو نہایت کاہل واقع ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ تنگ دستی کا شکار رہتا تھا۔ وہ نہ تو کبھی اپنے کھیتوں پر جاتا تھا اور نہ ہی مویشیوں کی خبر رکھتا تھا۔ نوکر چاکر ہی اس کے تمام کاموں کو انجام دیتے تھے۔ اس طرح اس کے کھیتوں سے نفع کی بجائے نقصان ہونے لگا۔ گھی دودھ کا کاروبار بھی پہلے جیسا نہ رہا۔ ایک دن فضلو کا دوست رحیم اس کے گھر آیا۔ رحیم نے فضلو کے گھر کی حالت کا اندازہ لگا لیا۔ فضلو نے بھی دبی زبان سے اپنی تنگ دستی کا اظہار کیا۔ رحیم بہت سمجھ بوجھ والا تھا فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے سوچا فضلو کی تمام پریشانیوں کا سبب اس کی کاہلی اور لاپروائی ہے۔ وہ فضلو سے بولا۔

"دوست! تمھاری پریشانی دیکھ کر مجھے نہایت تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تمھاری پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے تمھیں ایک آسان طریقہ بتاتا ہوں۔"

"وہ طریقہ کیا ہے جلدی بتاؤ۔" فضلو نے بے تابی سے پوچھا۔

رحیم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "سنو دوست! سورج نکلنے سے پہلے جنگل میں کسی جگہ ایک سنہرا ہنس دانہ چگنے کے لیے آتا ہے اور دوپہر ہوتے ہی وہ واپس چلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص اس ہنس کے دیدار کر لیتا ہے وہ کبھی تنگ دست اور پریشان نہیں رہتا۔ تمھیں اس سنہرے ہنس کو تلاش کرنا ہوگا۔"

"جیسے بھی ہو، میں اس سنہرے ہنس کے دیدار ضرور کروں گا۔"

اگلے دن فضلو کا دوست رحیم اپنے گھر واپس چلا گیا۔ دوسرے دن فضلو صبح ہی صبح اٹھ گیا۔ سنہرے ہنس کی تلاش میں نکلنے سے پہلے وہ ڈیری فارم میں گیا۔ گایوں کی دیکھ بھال کرنے والا ان کا دودھ دوہ کر اپنے گھر کے برتن میں ڈال رہا تھا۔ فضلو نے جب یہ حرکت دیکھی تو نوکر کو بہت ڈانٹ پلائی۔

گھر پر ناشتہ کرکے وہ ہنس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس بار اس کا رخ اپنے کھیتوں کی طرف تھا۔ اس نے دیکھا کہ مزدور ابھی تک کھیتوں پر نہیں آئے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر وہیں رک گیا۔ جب مزدور آئے تو اس نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ مزدور بڑے شرمندہ ہوئے۔

اس طرح فضلو جہاں جہاں گیا وہاں وہاں اسے اپنے کاروبار میں ہونے والے نقصان کا پتہ چلتا گیا اب صبح سویرے گھر سے نکلنا اور سارے کاموں کی دیکھ بھال کرنا، فضلو کا معمول بن گیا۔ نوکر چاکر ہشیار ہو گئے اور اپنے اپنے کاموں کو ایمانداری اور محنت سے انجام دینے لگے۔

فضلو کے کاروبار میں نقصان کی جگہ منافع ہونے لگا۔ گھر پر پڑے پڑے وہ بیمار اور سست رہنے لگا تھا۔ اب اس کی صحت بھی اچھی ہو گئی اور تنگ دستی کی جگہ خوشحالی آ گئی۔ گھر کے حالات بھی بہتر ہو گئے۔

ایک دن فضلو کا دوست رحیم پھر اس کے گھر آیا۔ فضلو نے کہا۔ "دوست! سنہری ہنس تو مجھے اب تک نہیں ملا۔ مگر اس کی تلاش میں لگے رہنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔"

رحیم ہنس پڑا اور بولا۔ "جانتا ہوں۔ کیا تمھیں سنہرے ہنس کی اصلیت پتہ ہے؟ دراصل محنت ہی وہ سنہرا ہنس ہے۔ جو اپنا کام خود نہ کرکے نوکروں پر چھوڑ دیتا ہے، وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے اور جو اپنا کام خود کرتا ہے وہ دولت اور عزت دونوں پاتا ہے۔"

□□□

282, Shah Nathan, Meerut-2, U.P.

قمر غزالہ

ککی مرغا اور سمبو بھیڑیا

پیارے بچو! جنگل میں مرغوں کی ایک بستی تھی، بستی میں کوئی شکاری جانور نہ داخل ہو سکے، اس کے لیے انھوں نے کڑا پہرہ لگا رکھا تھا۔ اگر کوئی شکاری بھولے سے بھی ان کی بستی میں داخل ہو جاتا تو اس کی خوب درگت بنائی جاتی۔

بستی میں ککی نام کا مرغا بھی رہتا تھا، جو بہت سمجھ دار اور چالاک تھا۔ ککی کئی بار شکاریوں کو چکمہ دے کر اپنی جان بچا چکا تھا، اسی وجہ سے وہاں رہنے والے دوسرے مرغے، اس سے جان بچانے کے طریقے سیکھتے تھے۔

مرغوں کی بستی کے پاس ہی سمبو نامی بھیڑیا رہتا تھا، اسے مرغوں کا گوشت بہت پسند تھا، وہ بستی کے مرغوں کا شکار کرنے کے نت نئے طریقے سوچتا رہتا تھا، لیکن اب تک ایک بھی مرغ اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

ایک دن سمبو پیڑ کے نیچے بیٹھا مرغوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا، تب ہی اس نے سوچا کہ ان مرغوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی عقل آ گئی ہے، ہاتھ ہی نہیں آتے، مجھے بھی عقل سے کام لینا چاہیے، پھر وہ ادھر ادھر ٹہلتا ہوا مرغوں کو پھانسنے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔

اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی اور وہ خوشی سے چلّایا ''یا ہو.....اب مجھے مرغوں کی دعوت اڑانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

سمبو فوراً مرغوں کی بستی کے باہر ایک گودام بنانے میں جٹ گیا۔

ککی مرغا پیڑ پر بیٹھا ہوا سمبو، کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔

اس نے چلا کر پوچھا ''سمبو! تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں یہاں مرغوں کی خدمت کرنے کے لیے مفت دانہ مرکز کھول رہا ہوں۔'' سمبو بولا

اس کی بات سن کر ککی مرغا چکرا گیا۔ بھیڑیا اور بھلائی کا کام.....!

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ضرور اس میں کوئی چال ہے، مجھے جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' یہ سوچ کر ککی مرغے نے کہا ''سمبو! تم کب سے بھلائی کے کام کرنے لگے اور پھر مرغوں ہی کی خدمت کیوں؟ اگر تمھیں خدمت کرنی ہے تو تم اپنے قبیلے کی خدمت کرو۔''

''ارے ککی! تم تو جانتے ہو کہ بھیڑیے کتنے چال باز ہوتے ہیں۔ میں ان کی طرح نہیں بننا چاہتا، اس لیے سب سے پہلے میں نے مرغوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' سمبو نے کہا۔

''نہیں.....تم کبھی مرغوں کی خدمت نہیں کرو گے، بلکہ تم ہم سب کو کھا جانے کے لیے کوئی چکر چلا رہے ہو'' ککی مرغا بولا۔

پہلے تو سمبو بھیڑیا گھبرایا، لیکن پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ جلد ہی اس نے پیڑ کے نیچے گودام بنا لیا۔

ککی مرغے نے بستی میں جا کر سب کو بھیڑیے کی چال بازی کے بارے میں بتایا۔

اگلے دن بھیڑیا دانہ لے آیا، اس نے دانوں سے بھری بوریاں گودام میں رکھ دیں اور گودام کے اوپر ''یہاں مرغوں کے لیے دانہ مفت ملتا ہے'' کا بڑا بورڈ لگا دیا۔

دو دن بیت جانے کے بعد بھی اس کے پاس کوئی مرغا دانہ کھانے نہیں پہنچا،لیکن جلدی ہی بھیڑیے کو موقع مل گیا۔ جنگل میں بارش ہوگئی، جس سے وہاں بکھرا ہوا دانہ بہہ گیا اور دانہ نہ ملنے پر مرغے بھوک سے تڑپ اٹھے۔

بھوک سے بے حال مرغے، سمو بھیڑیے کے پاس دانہ لینے پہنچنے لگے۔

یہ دیکھ کر ککی مرغے نے ایک بار پھر سب سے کہا: ''بھائیو! یہ بھیڑیا بڑا چالاک ہے، یہ ہماری بستی کے حفاظتی پہرے سے بہت پریشان تھا کہ اس کو مرغے کھانے کا موقع نہیں مل رہا، اب اس نے خدمت گار بننے کا ڈراما کیا ہے۔''

یہ سن کر سمو بھیڑیے نے گھبرا کر کہا'' مرغ بھائیو! ککی کی باتوں پر دھیان نہ دینا، وہ نہیں چاہتا کہ بنا محنت کیے تمھیں دانہ مل جائے، اس لیے وہ تم سب کو بھڑکا رہا ہے۔''

''ہاں..... ہاں..... سمو صحیح کہہ رہا ہے، وہ تو ہماری مدد کرنا چاہتا ہے، ہمیں اس سے ہی دانہ لینا چاہیے'' سارے مرغے چلا کر بولے۔

یہ سن کر ککی مرغا چیخا ''نہیں..... تم سب بے وقوفی کر رہے ہو۔ میری بات مانو، اس جھوٹے اور مکار سے دانہ مت لینا، یہ تمھارا دشمن ہے۔''

''یہ مرغے مجھ سے دانہ کیوں نہ لیں؟ میرے پاس شیر کا دیا ہوا لائسنس ہے۔ لو بھائیو، شیر کا لائسنس دیکھو'' سمو سب کو ایک چھپا ہوا کاغذ دکھا کر بولا۔

اس کی یہ بات سن کر سب مرغے اس کی چال میں آ گئے۔ انھوں نے اس سے دانہ لینا شروع کر دیا۔

اس طرح مفت کا دانہ کھا کر مرغے موٹے اور سست ہو گئے، لیکن ککی پہلے جیسا ہی رہا۔ اس نے بھیڑیے سے دانہ نہیں لیا، بلکہ پہلے کی طرح دانہ کھوجنے جاتا رہا۔

ادھر مرغوں کے سست ہوتے ہی بھیڑیے نے ان کو پکڑ کر کھانا شروع کر دیا، جیسے ہی کوئی اکیلا مرغا اس کے پاس دانہ لینے آتا، وہ اس کی گردن توڑ دیتا اور فوراً ایک بوری میں ڈال دیتا، بے چارا مرغا چیخ بھی نہ پاتا۔

گودام بند کرنے کے بعد سمو مرغوں کو بوری میں سے نکالتا اور مزے سے کھاتا۔

دھیرے دھیرے مرغوں کی آبادی کم ہونے لگی۔ ککی جب بھی گنتی کرتا تو اسے ایک مرغا کم ملتا۔

سارے مرغوں کو مفت کا مال کھانے کی عادت پڑ گئی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی کتنی بڑی قیمت چکا رہے تھے۔

ککی مرغے نے یہ حالات دیکھے تو اس نے سمو بھیڑیے کی پول کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ فوراً جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس گیا اور اس کو بتایا'' صاحب! بھیڑیا ہم مرغوں کی بستی کے باہر مرغوں کی خدمت کے نام پر مفت

دانہ بانٹ رہا ہے۔ جب سے اس نے دانے کا گودام کھولا ہے، بستی میں مرغوں کی آبادی کم ہو رہی ہے۔ اور تو اور، اس کے پاس ایک لائسنس بھی ہے، جس کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ نے اسے دیا ہے۔''

''نہیں..... میں نے اس مکار کو کوئی لائسنس نہیں دیا۔ ویسے بھی جانوروں کی خدمت کرنا صرف نیک جانوروں کا کام ہے'' شیر گرج کر بولا۔

''تو بادشاہ سلامت، میری درخواست ہے کہ اس مکار بھیڑیے کو پکڑ کر جیل بھیج دیجیے۔'' ککی نے فریاد کی۔

''ہم اسے رنگے ہاتھوں ہی پکڑیں گے اور تمھیں ہماری مدد کرنی ہوگی۔'' شیر نے ککی مرغے سے کہا۔

ککی فوراً تیار ہو گیا۔

اگلے دن شیر سمو بھیڑیے کے دفتر کے سامنے پیڑ کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت ککی مرغا تھیلا لے کر سمو بھیڑیے کے پاس پہنچا اور بولا ''سمو! تھوڑا سا دانہ مجھے بھی دے دو۔''

''ارے ککی! آج تمھاری بھی عقل ٹھکانے آ ہی گئی۔'' بھیڑیا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''ہاں مجھے بہت بھوک لگی ہے، دانہ دے دو'' ..... ککی نے کہا

''بھیڑیا خوشی سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا'' اب تم کبھی واپس نہیں جاؤ گے۔ میں تمھیں کھا جاؤں گا، جیسے میں نے باقی مرغوں کو کھایا ہے۔'' اتنا کہہ کر بھیڑیا ککی پر جھپٹا۔

اسی وقت اچانک اسے زوردار ٹھوکر لگی، وہ گرا اور اس کے گرتے ہی ایک گرج دار آواز آئی'' مکار بھیڑیے! تو خدمت کی آڑ میں مرغوں کو کھا رہا ہے۔ اب چل جیل کی ہوا کھا۔''

سامنے شیر کو دیکھ کر سمو کی حالت خراب ہو گئی۔

وہ گڑگڑایا'' بادشاہ سلامت! مجھے معاف کر دیں۔ میں اب کبھی مرغوں کو نہیں کھاؤں گا، میں تو یہ جنگل ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

شیر نے اس کی ایک بات نہ سنی اور پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔

بستی کے مرغوں کو جب حقیقت کا پتہ چلا تو سب شرمندہ ہو کر ککی کے پاس آئے اور بولے۔'' ککی! ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں اس مکار سے دانہ نہیں لینا چاہیے تھا۔''

''کوئی بات نہیں، اب یہ خیال رکھنا کہ چال باز اور مکار کبھی بھلائی کا کام نہیں کر سکتے۔'' ککی مرغے نے کہا۔ اس کے بعد پھر کبھی مرغوں نے مفت کا دانہ نہیں کھایا۔

□□□

550, Hakim-G Street, Churiwalan, Delhi-110006

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجہ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

29	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
30	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
31	جنت سنگار	180.00	45.00
32	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00
33	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
34	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم) لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	387.00	97.00
35	مجموعہ نغز	268.00	67.00
36	مسدود راہیں	126.00	32.00
37	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
38	مولیئر	57.00	14.00
39	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
40	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
41	پشکن	60.00	15.00
42	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
43	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
44	قومی زبان	76.00	19.00
45	قواعد کیٹلاگ سازی	268.00	67.00
46	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
47	سیر کہسار	167.00	42.00
48	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
49	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
50	تنقید عقل محض	158.00	40.00
51	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
52	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
53	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
54	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
55	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
56	تالستائے	46.00	11.00
57	اصول معاشیات	47.00	12.00
58	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
59	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
60	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
61	وضاحتی کتابیات (جلد 1۔3-22)	2650.00	663.00

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور برعکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت 2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اوران کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلداول ودوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلداول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت''، نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت 1-/52 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''کلیات علی سردار جعفری'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ ''کلیات حسن نعیم'' میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے'' مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت -/63 روپے

Date of Publication : 24/09/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, October 2008, Vol. 10, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938